تدبّرِ قرآن

۲

البقرة

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود

سورہ کا مرکزی مضمون دعوت ایمان ہے

اس سورہ کا مرکزی مضمون دعوت ایمان ہے۔ ایمان کی طرف اشارہ تو، جیسا کہ ہم نے بیان کیا، سورۂ فاتحہ میں بھی ہو چکا ہے لیکن وہ اجمالی ایمان ہے جو جذبۂ شکر کی تحریک اور اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و رحمت کی نشانیوں کے مشاہدہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سورہ میں اس اجمال نے تفصیل کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ اس میں نہایت واضح طور پر قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ گویا سورۂ فاتحہ میں ایمان باللہ کا ذکر ہے اور سورۂ بقرہ میں ایمان بالرسالت کا۔

ایمان بالرسالت کی اہمیت

ایمان کی اصلی حقیقت ایمان بالرسالت ہی سے وجود پذیر ہوتی ہے۔ اگر ایمان بالرسالت موجود نہ ہو تو مجرد ایمان باللہ ہماری زندگی کو اللہ کے رنگ میں نہیں رنگ سکتا۔ زندگی پر اللہ کا رنگ اسی وقت چڑھتا ہے جب ایمان باللہ کے ساتھ ساتھ ایمان بالرسالت بھی پایا جائے۔

ایمان بالرسالت پیدا ایمان باللہ ہی سے ہوتا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ پہلی چیز اس دوسری چیز ہی کا ایک بالکل فطری نتیجہ ہے۔ ایمان باللہ سے بندہ کے اندر خدا کی ہدایت کے لیے ایک پیاس اور ایک تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ یہی پیاس اور تڑپ ہے جس کا اظہار سورۂ فاتحہ میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دعا سے ہو رہا ہے۔ اسی دعا کے جواب میں یہ سورۂ بقرہ قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دے رہی ہے۔ گویا بندے کو بتایا جا رہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی بندگی کے حق کو تسلیم کر چکنے کے بعد اس کے راستہ کی تلاش ہے تو اس کتاب پر اور اس رسول پر ایمان لاؤ جس پر یہ کتاب اتری۔

اس حقیقت کی روشنی میں اگر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ سورۂ فاتحہ اگرچہ بظاہر ایک نہایت چھوٹی سی سورہ ہے، لیکن فی الحقیقت وہ ایک نہایت ہی عظیم الشان سورہ ہے۔ کیونکہ اس کے تنے سے پہلی ہی شاخ جو پھوٹی ہے وہی اتنی بڑی ہے کہ ہماری ساری زندگی پر حاوی ہو گئی ہے۔ اس سے ہماری اس بات کی تصدیق ہوتی ہے جس کی طرف ہم نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں اشارہ کیا ہے کہ پورا قرآن درحقیقت اسی سورۂ فاتحہ کے تخم سے پیدا ہوا ہے اور یہ اسی شجرۂ طیبہ کے برگ و بار ہیں جو قرآن کے پورے تیس پاروں میں پھیلے

ہوتے ہیں۔

ب ۔ سورہ میں خطاب

اس سورہ میں اصل خطاب یہود سے

اس سورہ میں اصل خطاب تو یہود سے ہے لیکن ضمناً اس میں جگہ جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو، مسلمانوں کو، اور بنی اسمٰعیل کو بھی مخاطب کیا گیا ہے۔

یہود کو مخاطب کر کے ان کے ان تمام مزعومات و توہمات کی تردید کی گئی ہے جن کے سبب سے وہ اپنے آپ کو پیدائشی حقدارِ امامت و سیادت سمجھے بیٹھے تھے اور کسی ایسے نبی پر ایمان لانا اپنی توہین سمجھتے تھے جو ان کے خاندان سے باہر امّی عربوں میں پیدا ہوا ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے جگہ جگہ آپ کو صبر و استقامت کی نصیحت کی گئی ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت جو دعا کی تھی آپ اس دعا کے مظہر ہیں۔ مخالفین کی تمام حاسدانہ سرگرمیوں کے علی الرغم آپ کی دعوت کامیاب ہو کے رہے گی اور اللہ تعالےٰ آپ کے دین کو غالب کرے گا۔

مسلمانوں سے خطاب کر کے یہ بات کہی گئی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے خلق پر اپنے دین کی حجت تمام کرنے کے لیے ان کو ایک مستقل امّت کی حیثیت سے مامور کیا ہے اور اپنی آخری شریعت کا ان کو امین بنایا ہے، انہیں چاہیئے کہ وہ اس امانت کی قدر کریں اور اس کے حامل بنیں تا کہ وہ خلق کے رہنما اور اپنے بعد والوں کے لیے نمونہ اور مثال بن سکیں۔

اسی ضمن میں ان کو جگہ جگہ یہود کی ان حاسدانہ سرگرمیوں سے بھی آگاہ کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے دلوں میں شکوک پیدا کرنے، ان کو ورغلانے اور ان کو آخری بعثت کی نعمتوں سے محروم کرنے کے لیے ان کی طرف سے ظاہر ہو رہی تھیں۔

بنی اسماعیل کو مخاطب کر کے ان کے سامنے اصل دینِ ابراہیمی ان تمام بدعتوں اور خرابیوں سے پاک کر کے پیش کیا گیا ہے جو مشرکین اور یہود نے اس میں پیدا کر دی تھیں اور ساتھ ہی ان پر یہ واضح کیا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالےٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے اپنا آخری نبی تمہارے اندر سے اٹھایا، اور تمہیں ایک امت مسلمہ بنانا چاہا، تم اس احسان کی قدر کرو اور یہودیوں کی حاسدانہ چالوں کے چکر میں نہ پھنسو، ورنہ تم پرائے شگون پر خود اپنی ناک کٹوا بیٹھو گے۔

ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کا تفصیلی تجزیہ تو اس وقت سامنے آئے گا جب ہم آیات کے مناسب حصّوں کو الگ

الگ ہے کران کی تفسیر کریں گے لیکن یہاں بھی ہم اس کے مطالب کا ایک سرسری جائزہ پیش کیے دیتے ہیں۔ اس سے سورہ کے عمود کے ساتھ اس کے ہر حصہ کا تعلق بھی سمجھنے میں مدد ملے گی اور سورہ پر بحیثیت مجموعی ایک اجمالی نظر بھی پڑ جائے گی۔

ہمارے نزدیک مضامین کی تقسیم کے لحاظ سے یہ سورہ ایک تمہید، چار ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔

تمہید [۱-۲۹] یہ حصہ تمہیدی ہے۔ اس میں پہلے تو یہ واضح کیا گیا ہے کہ اس کتاب پر کون لوگ ایمان لائیں گے، کون لوگ ایمان نہیں لائیں گے پھر ایمان نہ لانے والوں کی رکاوٹیں اور ان کی ذہنی الجھنیں بیان ہوتی ہیں جن میں وہ قرآن کے نزول کے بعد مبتلا ہو گئے تھے۔ اسی ضمن میں بنی اسمٰعیل کو تنبیہ کیا گیا ہے کہ ان پر اللہ کی اس کتاب نے حجت تمام کر دی ہے، اب ان کی شامت ہی ہے جو یہودی فتنہ پردازوں کے چکموں میں آکر وہ اپنے آپ کو اس نعمت عظمٰی سے محروم کر بیٹھیں۔

یہ تمہیدی حصہ آدم کی خلافت اور شیطان کی حاسدانہ مخالفت کی سرگزشت پر ختم ہوتا ہے۔ آدم اور شیطان کی یہ سرگزشت ایک آئینہ ہے جس میں اس تمام مخالفت اور موافقت کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت اور قرآن کی دعوت سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ فرشتوں کا آدم کی خلافت پر اعتراض کرنا اور اپنے اعتراض کا جواب پا جانے کے بعد مطمئن ہو جانا مثال ہے ان لوگوں کی مخالفت کی جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے بعض پہلو نہ سمجھنے کے سبب سے شروع شروع میں آپ کی رسالت کے بارہ میں متردد یا اس کے مخالف رہے لیکن چونکہ یہ لوگ نیک دل اور حق پسند تھے، حاسد اور ہٹ دھرم نہ تھے، اس وجہ سے جونہی ان پر اصل حقیقت واضح ہو گئی وہ آپ کے حامی اور مددگار بن گئے۔

اس کے برخلاف شیطان کی مخالفت مثال ہے ان لوگوں کی مخالفت کی جو غرور نسب، غرور جاہ یا حسد کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کر رہے تھے۔ مثلاً یہود اور سرداران قریش۔ اس طرح کی مخالفت کرنے والوں کی مخالفت اصل حقیقت کے واضح ہونے سے دور نہیں ہوتی بلکہ اور زیادہ بڑھ جایا کرتی ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کی صداقت جتنی ہی زیادہ واضح ہوتی گئی اتنی ہی ان لوگوں کی عداوت بھی بڑھتی گئی۔

اس تصویر میں یہود اور ان کے ہم نواؤں پر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ آدم کی خلافت کے خلاف جس نوعیت کا غم و غصہ اور حسد ابلیس کو تھا اسی نوعیت کا غم و غصہ اور حسد اللہ کے آخری رسولؐ کے خلاف تم کو ہے۔ اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح کر دی گئی ہے کہ جس طرح ابلیس کے غم و غصہ کے علی الرغم آدم کی خلافت

قائم ہو کے رہی۔ اسی طرح تمہاری دشمنی اور تمہارے حسد کے علی الرغم نبی امی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت قائم ہو کے رہے گی۔

یہود کو دعوت

[۳۹ - ۱۲۱] اس حصہ میں بنی اسرائیل کو تصریح کے ساتھ مخاطب کر کے پہلے ان کو اس بات کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ اس نبی امی پر ایمان لائیں جس کی بعثت کی پیشین گوئیاں خود ان کے اپنے صحیفوں میں بھی موجود ہیں۔ پھر ان کو تنبیہ کی گئی ہے کہ جس دعوتِ حق کی تائید و حمایت میں سبقت کرنے کے لیے ان سے تورات میں عہد لیا جا چکا ہے، دنیا پرستی اور حسد میں مبتلا ہو کر اس کی مخالفت کے لیے سبقت نہ کریں۔ نیز اس ذلیل مقصد کے لیے حق اور باطل کو باہم گڈمڈ کرنے کا جو کاروبار انہوں نے جاری کر رکھا ہے اس سے باز آئیں۔ اور اس جہاد نفس میں صبر اور نماز سے مدد حاصل کریں۔ (۴۰-۴۶)

اس کے بعد یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خدا کے ہاں عزت و تقرب کا ذریعہ ایمان اور عمل صالح ہے نہ کہ کسی خاص خاندان یا کسی خاص گروہ سے وابستہ ہونا۔ یہود اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ان کو جو عزت و عظمت حاصل ہوئی ہے وہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ کی اولاد میں سے ہونے کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ اس غلط فہمی کے سبب سے ان کا سارا اعتماد ایمان اور عمل صالح کے بجائے محض اپنی خاندانی اور گروہی نسبت پر رہ گیا تھا۔ اور یہ غرہ ان کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانے میں بہت بڑی رکاوٹ بن گیا تھا۔ یہاں ان پر واضح کیا گیا ہے کہ تمام فضل و کرم اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، جو فضل بھی تم پر ہوا ہے اسی کی طرف سے ہوا ہے اور جو فضل بھی ہوگا اسی کی طرف سے ہوگا۔ اس نے تم پر فضل بھی بڑے بڑے کیے ہیں اور تمہاری ناشکریوں پر تم کو سزائیں بھی بار بار دی ہیں۔ اس وجہ سے خاندان اور نسب کی نسبتوں کے بجائے اللہ کی طرف رجوع کرو اور اوہام میں مبتلا ہو کر حقائق سے منہ نہ موڑو۔ (۴۷-۶۳)

یہود کو تنبیہ

اس کے بعد یہود کی عہد شکنیوں کی پوری تاریخ بیان ہوئی ہے کہ انہوں نے کس کس طرح خدا سے کیے ہوئے عہد و پیمان اور خدا کے دیئے ہوئے احکام توڑے ہیں اور عہد شکنی اور غداری کے لیے کیسی مجرمانہ ذہنیت شروع ہی سے ان کے اندر پرورش پاتی رہی ہے۔ نیز ان کے وہ اوہام اور وہ مشاغل بھی بیان ہوئے ہیں جن میں مبتلا ہو جانے کے سبب سے ان کی نگاہوں میں خدا اور اس کی شریعت اور اس کی کتاب کی کوئی قدر سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی تھی۔

یہ ساری تفصیل یہود پر یہ واضح کرنے کے لیے بیان کی گئی ہے کہ اگرچہ وہ کتاب الٰہی کے حامل ہونے کے مدعی ہیں لیکن فی الحقیقت انہوں نے اس کتاب کو بالکل پس پشت ڈال دیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے تمام عہد و پیمان انہوں نے توڑ ڈالے ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے منصب امامت سے معزول کرے اور یہ امانت ان کے حوالہ کرے جو اس کے اہل ہوں۔ (۶۴-۱۲۱)

حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت

[۱۲۲ - ۱۶۲] اس باب میں حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت کا وہ حصہ بیان ہوا ہے جو خانہ کعبہ کی تعمیر نیز ایک امت

مسلمہ کے قیام اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی دعا سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں پہلے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ذریت کا دین اسلام تھا، نہ کہ یہودیت و نصرانیت۔ اسی اسلام کی دعوت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک امتِ وسط پیدا کی ہے۔ اس امتِ وسط کا قبلہ دعائے ابراہیمی کے بموجب مسجد حرام ہے نہ کہ بیت المقدس۔ بیت المقدس کی طرف اس کا نماز پڑھنا محض ایک عارضی معاملہ تھا چنانچہ اس کا قبلہ بدل دیا گیا۔

اس کے بعد ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ یہ قبلہ چونکہ ابھی مشرکین کے قبضہ میں ہے، اس وجہ سے اس کو حاصل کرنے کے لیے اہلِ ایمان کو جان اور مال کی قربانیاں بھی دینی پڑیں گی۔ اور اس جہاد میں کامیابی اللہ تعالیٰ کی مدد سے حاصل ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کی یہ مدد صبر اور نماز کے ذریعے سے حاصل ہوگی۔

اس ساری سرگزشت کے سنانے سے مقصود چونکہ یہ واضح کرنا ہے کہ حضرت ابراہیم نے جس پیغمبر اور جس امت کے لیے دعا کی تھی وہ یہی ہیں، انہی کی دعوت اصل ملت ابراہیمی کی دعوت اور انہی کا قبلہ اصل قبلۂ ابراہیمی ہے۔ اس وجہ سے اس میں خانہ کعبہ اور مروہ وغیرہ سے متعلق یہود کی وہ تمام تحریفات بھی بے نقاب کی گئی ہیں جو انھوں نے اپنے صحیفوں میں اس خیال سے کی تھیں کہ خانہ کعبہ اور مروہ کی قربان گاہ کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعلق کی ہر شہادت ریکارڈ سے حذف کر دیں۔

احکام و قوانین

[۱۶۳ - ۲۴۲] یہ احکام و قوانین کا باب ہے۔ ملتِ مسلمہ کو جو شریعت عطا ہوئی ہے اس باب میں اس شریعت کے بنیادی قوانین بیان ہوئے ہیں۔ یہود یا مشرکین نے ان احکام میں جو تحریفات کر دی تھیں یا جو بدعتیں شامل کر دی تھیں اس باب میں ان بدعتوں اور تحریفات سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے۔ ان احکام کے بیان کرنے میں فقہی ترتیب ملحوظ نہیں ہے بلکہ وقت کے حالات اور تعلیم و تربیت کے مصالح نے جس ترتیب کا تقاضا کیا ہے وہ ترتیب ملحوظ ہے۔ بالاجمال یہ احکام یہ ہیں: توحید (۱۶۳ - ۱۷۶) نماز اور زکوٰۃ (۱۷۷) قصاص اور دیت (۱۷۸، ۱۷۹) وصیت (۱۸۰ - ۱۸۲) روزہ (۱۸۳، ۱۸۷) حرام خوری اور رشوت کی ممانعت (۱۸۸) حج اور اس تعلق سے جہاد اور انفاق کے احکام کیونکہ اس وقت تک خانہ کعبہ پر مشرکین کا قبضہ تھا (۱۸۹، ۲۱۸) شراب اور جوئے کی ممانعت، یتامیٰ کی اصلاح حال کے خیال سے ان کے معاملات کو اپنے معاملات کے ساتھ ملا لینے کی اجازت، مشرکات کے ساتھ نکاح کی ممانعت[1] (۲۱۹ - ۲۲۱) نکاح، طلاق، ایلاء، خلع، رضاعت، نان نفقہ، زوجہ متوفی عنہا، مہر اور ازدواجی زندگی سے متعلق دوسرے مسائل (۲۲۲ - ۲۴۲)

جہاد

[۲۴۳ - ۲۸۳] اس باب میں مرکز ملت ابراہیمی — خانہ کعبہ — کو کفار کے قبضہ سے آزاد کرانے کے لیے مسلمانوں کو جہاد پر ابھارا گیا ہے۔ اس جہاد ہی کے مقصد سے انفاق کا جذبہ بھڑکایا گیا ہے۔ بنی اسرائیل نے اپنے قبلہ کو فلسطینیوں سے آزاد کرانے کے لیے جو جنگ لڑی اور جو مختلف پہلوؤں سے ہمارے غزوۂ بدر سے مشابہ

---

[1] یہ تینوں مسائل جیسا کہ ہم آگے چل کر ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے واضح کریں گے۔ انفاق کے حکم کے تعلق سے پیدا ہوئے ہیں۔

تھی، اس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ پھر ایک جملہ معترضہ کے بعد انفاق پر مزید زور دیا گیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں مثالوں سے واضح فرمایا گیا ہے کہ کس طرح کے لوگ ہیں جن کو خدا تاریکی سے روشنی کی طرف لاتا ہے اور کس طرح کے لوگوں کو تاریکیوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد انفاق کی برکات، اس کے شرائط، اس کی خصوصیات اور اس کے بعض اہم مصارف کی طرف اشارات ہیں اور ساتھ ہی جو چیز اس کی بالکل ضد ہے یعنی سود اس کی حرمت بیان کی گئی ہے اور قرض کے لین دین میں جو احتیاط اسلامی نقطۂ نظر سے ضروری ہے اس کے متعلق بعض احکام دیے گئے ہیں۔

خاتمہ

[۲۸۴ - ۲۸۶] اس حصہ کی حیثیت سورہ کے خاتمہ کی ہے۔ اس میں پہلے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کے قبضہ میں ہے، وہ تمام کھلے اور ڈھکے کا حساب لے گا اور پھر جس کو چاہے گا بخشے گا، اور جس کو چاہے گا سزا دے گا۔ اس کے بعد یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ یہ کتاب جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتاری گئی ہے کوئی اس کو مانے یا نہ مانے لیکن اللہ تعالیٰ کے رسولؐ اور اہل ایمان نے اس کو مان لیا ہے۔ اس کے بعد اہل ایمان کی دعا پر یہ سورہ ختم ہوتی ہے۔ اس دعا کے لفظ لفظ سے کتاب الٰہی کے بارہ میں اس عظیم ذمہ داری کا احساس نمایاں ہو رہا ہے جس کو یہود اور نصاریٰ سنبھال نہ سکے اور جو اب اس امت پر ڈالی جا رہی ہے۔

سورة البقرة (۲)

مدنیّة — ایاتها ۲۸۶

بسم الله الرحمٰن الرحیم ○

آیات ۱-۵

الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛۚ فِیْهِ ۛۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۙ﴿۳﴾ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ؕ﴿۴﴾ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵﴾

ترجمہ آیات ۱-۵

یہ الف، لام، میم ہے۔ یہ کتاب الٰہی ہے۔ اس کے کتاب الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لیے۔ ان لوگوں کے لیے جو غیب میں رہتے ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور ان کے لیے جو ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو تم پر اتاری گئی ہے اور جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے اور آخرت پر یہی لوگ یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ ۱-۵

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

حروف مقطعات سورتوں کے نام ہیں۔

الۤمّۤ: یہ ایک مستقل جملہ ہے۔ عربی زبان کے عام قاعدے کے مطابق یہاں مبتدا محذوف ہے۔ اس کو ظاہر کر دیا جائے تو پوری بات یوں ہوگی۔ ھٰذا الۤمّۤ (یہ الف، لام، میم ہے) ہم نے ترجمہ میں اس حذف کو کھول دیا ہے۔

یہ اور اس طرح کے جتنے حروف بھی مختلف سورتوں کے شروع میں آتے ہیں چونکہ الگ الگ کرکے پڑھے جاتے ہیں اس وجہ سے ان کو حروف مقطعات کہتے ہیں۔

یہ جس سورہ میں بھی آتے ہیں بالکل شروع میں اس طرح آتے ہیں جس طرح کتابوں، فصلوں اور ابواب کے شروع میں ان کے نام آیا کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان سورتوں کے نام ہیں۔ قرآن نے جگہ جگہ ذٰلِکَ اور تِلْکَ کے ذریعہ سے ان کی طرف اشارہ کرکے ان کے نام ہونے کو اور زیادہ واضح کر دیا ہے۔ حدیثوں سے بھی ان کا نام ہی ہونا ثابت ہوتا ہے۔

جو سورتیں ان ناموں سے موسوم ہیں اگرچہ ان میں سے سب اپنے انہی ناموں سے مشہور نہیں ہوئیں، بلکہ بعض دوسرے ناموں سے مشہور ہوئیں لیکن ان میں سے کچھ اپنے انہی ناموں سے مشہور بھی ہیں۔ مثلاً طٰہٰ، یٰسٓ، قٓ اور نٓ وغیرہ۔

'مقطعات' کے معانی

ان ناموں کے معانی کے بارے میں کوئی قطعی بات کہنا بڑا مشکل ہے اس وجہ سے ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ قرآن کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ ایک بالکل واضح کتاب ہے، اس میں کوئی چیز بھی چیستاں یا معمے کی قسم کی نہیں ہے، پھر اس نے سورتوں کے نام ایسے کیوں رکھ دیئے جن کے معنی کسی کو بھی نہیں معلوم؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک ان حروف کا تعلق ہے یہ اہل عرب کے لیے کوئی بیگانہ چیز نہیں تھے۔ بلکہ وہ ان کے استعمال سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس واقفیت کے بعد قرآن کی سورتوں کا ان حروف سے موسوم ہونا کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے قرآن کے ایک واضح کتاب ہونے پر کوئی حرف آتا ہو۔ البتہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح حروف سے نام بنا لینا عربوں کے مذاق کے مطابق تھا بھی یا نہیں تو اس چیز کے مذاق عرب کے مطابق ہونے کی سب سے بڑی شہادت تو یہی ہے کہ قرآن نے نام رکھنے کے اس طریقہ کو اختیار کیا۔ اگر نام رکھنے کا یہ طریقہ کوئی ایسا طریقہ ہوتا جس سے اہل عرب بالکل ہی نامانوس ہوتے تو وہ اس پر ضرور ناک بھوں چڑھاتے اور ان حروف کی آڑ لے کر کہتے کہ جس کتاب کی سورتوں کے نام تک کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتے اس کے ایک کتاب مبین ہونے کے دعوے کو کون تسلیم کر سکتا ہے۔

قرآن پر اہل عرب نے بہت سے اعتراضات کئے اور ان کے یہ سارے اعتراض قرآن نے نقل بھی کیے ہیں لیکن ان کے اس طرح کے کسی اعتراض کا کوئی ذکر نہیں کیا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان ناموں میں ان کے لیے

کوئی اجنبیت نہیں تھی۔

علاوہ بریں جن لوگوں کی نظر اہل عرب کی روایات اور ان کے لٹریچر پر ہے وہ جانتے ہیں کہ اہل عرب نہ صرف یہ کہ اس طرح کے ناموں سے نامانوس نہیں تھے بلکہ وہ خود اشخاص، چیزوں، گھوڑوں، جھنڈوں، تلواروں حتیٰ کہ قصائد اور خطبات تک کے نام اسی سے ملتے جلتے رکھتے تھے۔ یہ نام مفرد حروف پر بھی ہوتے تھے اور مرکب بھی ہوتے تھے۔ ان میں یہ اہتمام بھی ضروری نہیں تھا کہ اسم اور مسمّٰی میں کوئی معنوی مناسبت پہلے سے موجود ہو بلکہ یہ نام ہی بتاتا تھا کہ یہ نام اس مسمّٰی کے لیے وضع ہوا ہے۔

اور یہ ایک بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ جب ایک شے کے متعلق یہ معلوم ہو گیا کہ یہ نام ہے تو پھر اس کے معنی کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا کیونکہ نام سے اصل مقصود مسمّٰی کا اس نام کے ساتھ خاص ہو جاتا ہے نہ کہ اس کے معنی۔ کم از کم فہم قرآن کے نقطۂ نظر سے ان ناموں کے معانی کی تحقیق کی تو کوئی خاص اہمیت ہے نہیں۔ بس اتنی بات ہے کہ چونکہ یہ نام اللہ تعالیٰ کے رکھے ہوئے ہیں اس وجہ سے آدمی کو یہ خیال ہوتا ہے کہ ضرور یہ کسی نہ کسی مناسبت کی بنا پر رکھے گئے ہوں گے۔ یہ خیال فطری طور پر طبیعت میں ایک جستجو پیدا کر دیتا ہے اسی جستجو کی بنا پر ہمارے بہت سے پچھلے علماء نے ان ناموں پر غور کیا اور ان کے معنی معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ ان کی جستجو سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا لیکن ہمارے نزدیک ان کا یہ کام بجائے خود غلط نہیں تھا اور اگر ہم بھی ان پر غور کریں گے تو ہمارا یہ کام بھی غلط نہیں ہو گا۔ اگر اس کوشش سے کوئی حقیقت واضح ہوئی تو اس سے ہمارے علم میں اضافہ ہو گا اور اگر کوئی بات نہ مل سکی تو اس کو ہم اپنے علم کی کوتاہی اور قرآن کے اتھاہ ہونے پر محمول کریں گے۔ یہ رائے بہرحال نہیں قائم کریں گے کہ یہ نام ہی بے معنی ہیں۔

اپنے علم کی کمی اور قرآن کے اتھاہ ہونے کا یہ احساس بجائے خود ایک بہت بڑا علم ہے۔ اس احساس سے علم و معرفت کی بہت سی بند راہیں کھلتی ہیں۔ اگر قرآن کا پہلا ہی حرف اس عظیم انکشاف کے لیے کلید بن جائے تو یہ بھی قرآن کے بہت سے معجزوں میں سے ایک معجزہ ہو گا۔ یہ اسی کتاب کا کمال ہے کہ اس کے جس حرف کا راز کسی پر نہ کھل سکا اس کی پیدا کردہ کاوش ہزاروں سربستہ اسرار سے پردہ اٹھانے کے لیے دلیل راہ بنی۔

حروف مقطعات کے متعلق امام فراہیؒ کا نقطۂ نظر

ان حروف پر ہمارے پچھلے علماء نے جو رائیں ظاہر کی ہیں ہمارے نزدیک وہ تو کسی مضبوط بنیاد پر مبنی نہیں ہیں اس وجہ سے ان کا ذکر کرنا کچھ مفید نہیں ہو گا۔ البتہ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے اجمالاً میں یہاں پیش کرتا ہوں۔ اس سے اصل مسئلہ اگرچہ حل نہیں ہوتا لیکن اس کے حل کے لیے ایک راہ کھلتی ضرور نظر آتی ہے۔ کیا عجب کہ مولاناؒ نے جو سراغ دیا ہے دوسرے اس کی رہنمائی سے کچھ مفید نشانات راہ اور معلوم کر لیں اور اس طرح درجہ بدرجہ تحقیق کے قدم کچھ اور آگے بڑھ جائیں۔

جو لوگ عربی رسم الخط کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ عربی زبان کے حروف عبرانی سے لیے گئے ہیں اور عبرانی کے یہ حروف ان حروف سے ماخوذ ہیں جو عرب قدیم میں رائج تھے۔ عرب قدیم کے ان حروف

کے متعلق استاذ امامؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ انگریزی اور ہندی کے حروف کی طرح صرف آواز ہی نہیں بتاتے تھے بلکہ یہ چینی زبان کے حروف کی طرح معانی اور اشیاء پر بھی دلیل ہوتے تھے اور جن معانی یا اشیاء پر وہ دلیل ہوتے تھے عموماً انہی کی صورت و ہیئت پر لکھے بھی جاتے تھے۔ مولاناؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہی حروف ہیں جو قدیم مصریوں نے اخذ کیے اور اپنے تصورات کے مطابق ان میں ترمیم و اصلاح کر کے ان کو اس خط تمثالی کی شکل دی جس کے آثار اہرام مصر کے کتبات میں موجود ہیں۔

ان حروف کے معانی کا علم اب اگرچہ مٹ چکا ہے تاہم بعض حروف کے معنی اب بھی معلوم ہیں اور ان کے لکھنے کے ڈھنگ میں بھی ان کی قدیم شکل کی کچھ نہ کچھ جھلک پائی جاتی ہے۔ مثلاً الف کے متعلق معلوم ہے کہ وہ گائے کے معنی بتاتا تھا اور گائے کے سر کی صورت ہی پر لکھا جاتا تھا۔ "ب" کو عبرانی میں بیت کہتے بھی ہیں اور اس کے معنی بھی بیت (گھر) کے ہیں۔ "ج" کا عبرانی تلفظ جیمل ہے جس کے معنی جمل (اونٹ) کے ہیں۔ "ط" سانپ کے معنی میں آتا تھا اور لکھا بھی کچھ سانپ ہی کی شکل پر جاتا تھا۔ "م" پانی کی لہر پر دلیل ہوتا تھا اور اس کی شکل بھی لہر سے ملتی جلتی بنائی جاتی تھی۔

مولانا اپنے نظریہ کی تائید میں سورہ "ن" کو پیش کرتے ہیں۔ حرف "نون" اب بھی اپنے قدیم معنی ہی میں بولا جاتا ہے۔ اس کے معنی مچھلی کے ہیں اور جو سورہ اس نام سے موسوم ہوئی ہے اس میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر صاحب الحوت (مچھلی والے) کے نام سے آیا ہے۔ مولانا اس نام کو پیش کر کے فرماتے ہیں کہ اس سے ذہن قدرتی طور پر اس طرف جاتا ہے کہ اس سورہ کا نام "نون" (ن) اسی وجہ سے رکھا گیا ہے کہ اس میں صاحب الحوت (یونس علیہ السلام) کا واقعہ بیان ہوا ہے جن کو مچھلی نے نگل لیا تھا۔ پھر کیا عجب ہے کہ بعض دوسری سورتوں کے شروع میں جو حروف آئے ہیں وہ بھی اپنے قدیم معانی اور سورتوں کے مضامین کے درمیان کسی مناسبت ہی کی بنا پر آئے ہوں۔

قرآن مجید کی بعض اور سورتوں کے ناموں سے بھی مولانا کے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً حرف "ط" کے معنی، جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، سانپ کے تھے اور اس کے لکھنے کی ہیئت بھی سانپ کی ہیئت سے ملتی جلتی ہوتی تھی۔ اب قرآن میں سورہ طٰہٰ کو دیکھیے جو "ط" سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں ایک مختصر تمہید کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی لٹھیا کے سانپ بن جانے کا قصہ بیان ہوتا ہے۔ اسی طرح طسم، طس وغیرہ بھی "ط" سے شروع ہوتی ہیں اور ان میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لٹھیا کے سانپ کی شکل اختیار کر لینے کا معجزہ مذکور ہے۔

"الف" کے متعلق ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ گائے کے سر کی ہیئت پر لکھا بھی جاتا تھا اور گائے کے معنی بتاتا بھی تھا۔ اس کے دوسرے معنی اللہ واحد کے ہوتے تھے۔ اب قرآن مجید میں دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ سورۂ بقرہ میں جس کا نام الف سے شروع ہوتا ہے، گائے کے ذبح کا قصہ بیان ہوا ہے۔ دوسری سورتیں جن کے نام الف سے شروع

ہوتے ہیں توحید کے مضمون میں مشترک نظر آتی ہیں۔ یہ مضمون ان میں خاص اہتمام کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ان ناموں کا یہ پہلو بھی خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ جن سورتوں کے نام ملتے جلتے سے ہیں ان کے مضامین بھی ملتے جلتے ہیں بلکہ بعض سورتوں میں تو اسلوب بیان تک ملتا جلتا ہے۔

میں نے مولانا کا یہ نظریہ، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، محض اس خیال سے پیش کیا ہے کہ اس سے حروف مقطعات پر غور کرنے کے لیے ایک علمی راہ کھلتی ہے۔ میرے نزدیک اس کی حیثیت ابھی تک ایک نظریہ سے زیادہ نہیں ہے۔ جب تک تمام حروف کے معانی کی تحقیق ہو کر ہر پہلو سے ان ناموں اور ان سے موسوم سورتوں کی مناسبت واضح نہ ہو جائے اس وقت تک اس پر ایک نظریہ سے زیادہ اعتماد کر لینا صحیح نہیں ہوگا۔ یہ محض علوم قرآن کے قدر دانوں کے لیے ایک اشارہ ہے، جو لوگ مزید تحقیق و جستجو کی ہمت رکھتے ہیں وہ اس راہ میں قسمت آزمائی کریں، شاید اللہ تعالیٰ اس راہ سے یہ مشکل آسان کر دے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (۲)

اشارہ قریب و بعید کی حقیقت

ذٰلِكَ :۔ اہل نحو کہتے ہیں کہ "ذٰلِكَ" اشارہ بعید کے لیے آتا ہے اور "هٰذَا" اشارہ قریب کے لیے۔ اس سے عام طور پر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اگر کسی فاصلہ کی چیز کی طرف اشارہ کرنا ہو تو 'ذٰلِكَ' لائیں گے اور اگر قریب کی کسی چیز کی طرف اشارہ کرنا ہو تو "هٰذَا" استعمال کریں گے، لیکن اہل نحو کا مطلب قرب اور بعید سے یہ نہیں ہے، ان کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز مخاطب کے علم میں ہے یا جس کا ذکر گفتگو میں ہو چکا ہے اگر اس کی طرف اشارہ کرنا ہو تو وہاں 'ذٰلِكَ' استعمال کریں گے اور اگر کسی ایسی چیز کی طرف اشارہ کرنا ہو جس کا ذکر آگے آ رہا ہو تو وہاں 'هٰذَا' لائیں گے۔ اہل زبان ان دونوں اشارات کو اسی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اور اگر کبھی ان کو اس عام ضابطہ کے خلاف استعمال کرتے ہیں تو بلاغت کے کسی نکتہ کو ملحوظ رکھ کر کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی سابق الذکر چیز کی طرف اشارہ کرنے کے لیے 'هٰذَا' استعمال کر دیں تو اس سے مقصود اس شے کو نگاہوں کے سامنے حاضر کر دینا ہوگا۔ اسی طرح اگر کہیں 'هٰذَا' کی جگہ 'ذٰلِكَ' استعمال ہوتا ہے تو اس سے عموماً مقصود اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی شان اس سے ارفع ہے کہ اس کو سامنے لا کھڑا کیا جائے۔

یہاں ذٰلِكَ[1] کا اشارہ سورہ کے اس نام کی طرف ہے جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اور بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ الٓمّٓ قرآن عظیم کا ایک حصہ ہے۔ قرآن میں اس قسم کے اشارات کی نظیریں بکثرت موجود ہیں۔ مثلاً حٰمٓ

---

[1] ان اشارات میں مذکر و مؤنث کا فرق بلاغت کے بعض تقاضوں کی بنا پر ہوتا ہے۔ یہاں ہم تحقیق الفاظ میں ایک خاص حد سے آگے نہیں جانا چاہتے اس وجہ سے ان چیزوں سے زیادہ تعرض نہیں کریں گے جو دوسری اہل تحقیق کی کتابوں میں بھی آسانی سے مل سکیں گی۔ بس اتنی بات یاد رکھنی چاہیے کہ کبھی اشارہ میں معہود ذہنی کتاب یا قرآن ہوتا ہے کبھی سورہ۔ اس وجہ سے اشارہ کہیں ذٰلِكَ آتا ہے اور کہیں تِلْكَ۔

عٓسٓقٓ ۔ کَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (شوریٰ ۱ - ۳)
(یہ حٰمٓ عٓسٓقٓ ہے۔ اسی طرح خدائے عزیز و حکیم تمہاری طرف وحی کرتا ہے اور اسی طرح اس نے ان لوگوں کی طرف وحی کی جو تم سے پہلے گزرے) طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۝ (النمل) (یہ طٰس ہے۔ یہ قرآن اور ایک کتاب مبین کی آیتیں ہیں۔

لفظ کتاب کے معانی

الکتٰب : قرآن مجید میں کتاب کا لفظ پانچ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

۱۔ نوشتۂ تقدیر۔ مثلاً لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۶۸۔ انفال)
اگر نوشتۂ الٰہی نہ گزر چکا ہوتا تو جس چیز میں تم مبتلا ہوئے اس کے باعث تمہیں ایک دردناک عذاب آ پکڑتا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا وہ رجسٹر جس میں ہر چیز ریکارڈ ہے۔ مثلاً وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ (۴، ق) (اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے محفوظ رکھنے والی)

۳۔ خط اور پیغام۔ مثلاً اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ (۲۹۔ نمل) (میرے پاس ایک گرامی نامہ بھجوایا گیا ہے)

۴۔ احکام و قوانین۔ مثلاً وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۲۔ جمعہ) (اور ان کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ کا اتارا ہوا کلام۔ اپنے اسی معنی کے لحاظ سے یہ لفظ کتابِ الٰہی کے لیے استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد کتابِ الٰہی کا کوئی خاص حصہ بھی ہوا کرتا ہے اور اس کا مجموعہ بھی۔

مجموعہ کے مفہوم کے لیے نظیر اعراف کی یہ آیت ہے۔ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ (۱۷۰۔ اعراف) (اور جو کتابِ الٰہی کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں)

دوسرے معنی کے لیے نظیر سورۂ آل عمران کی یہ آیت ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ (۲۲۔ آل عمران) (ذرا دیکھو تو ان کو جنھیں کتابِ الٰہی کا ایک حصہ ملا ان کو دعوت دی جا رہی ہے اللہ کی کتاب کی طرف تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کرے)

جس طرح کوئی لفظ اپنے مختلف معانی میں سے کسی ایک اعلیٰ اور برتر معنی کے لیے خاص ہو جایا کرتا ہے، اسی طرح یہ کتاب کا لفظ بھی خاص طور پر کتابِ الٰہی کے لیے بولا جانے لگا۔ چنانچہ یہ استعمال قدیم زمانہ سے معروف ہے۔ یہود انبیاء کے صحیفوں میں سے ہر صحیفہ کو سِفر کہتے تھے جس کے معنی کتاب کے ہیں، عیسائی مترجموں نے ان کتابوں کو بائیبل کا نام دیا اس کے معنی بھی یونانی میں کتاب ہی کے ہیں۔ اسی طرح ان صحیفوں کے لیے (Scriptures) کا لفظ استعمال ہوا جس کے معنی لاطینی میں کتاب کے ہیں۔ الغرض کتاب کا لفظ کتاب اللہ کے لیے کوئی نیا استعمال نہیں ہے، یہ استعمال جیسا کہ واضح ہوا، بہت قدیم ہے۔ قرآن نے بھی اس معنی میں اس لفظ کو استعمال کیا اور اپنے استعمالات سے اس کے اس معنی کو اس قدر واضح کر دیا کہ اس کے مخاطب اس استعمال کو بے تکلف سمجھنے لگ گئے۔

لَا رَيْبَ فِيْهِ کا صحیح مفہوم

لَا رَيْبَ فِيْهِ : ریب کے معنی شک کے ہیں۔ "اس میں کوئی شک نہیں ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اس کے کتابِ

الٰہی ہونے یا ایک کتاب منزل ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ جملہ پہلے جملہ کی خبر نہیں بلکہ اس کی تاکید ہے ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کے معنی ہیں، یہ کتابِ الٰہی ہے۔ اس کے بعد یہ تاکید اسی حقیقت کو مزید قوت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے کہ اس کے کتابِ الٰہی ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

اگر اس کے معنی یہ نہ لیے جائیں تو پھر اس ٹکڑے کے لئے یہاں کوئی موزوں موقع ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ قرآن مجید کے نظائر سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً اسی سورہ میں چند ہی آیات کے بعد فرمایا ہے۔ وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (۲۳۔ بقرہ) (اور اگر تم اس کی طرف سے شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندہ پر اتاری ہے تو لاؤ اس کے مانند کوئی ایک سورہ) الٓمّٓ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۔ السجدہ) (الٓمّٓ، کتاب کی تنزیل، جس کے کتابِ الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، عالم کے خداوند کی طرف سے ہے)۔ حٰمٓ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (۱-۲ مومن) (حٰمٓ، کتاب کا اتارنا خدائے عزیز و علیم کی طرف سے ہے)

عام طور پر لوگ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اس کتاب میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس میں شک کیا جا سکے۔ اگرچہ بجائے خود یہ ایک حقیقت ہے، قرآن میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہو لیکن ہمارے نزدیک اس جملہ کا یہ مطلب نہیں ہے۔ اس کے کئی وجوہ ہیں۔

اوّلاً تو قرآن کے نظائر جو ہم نے پیش کیے ہیں اس مطلب کے خلاف ہیں۔ ثانیاً شک و شبہ کتاب کی صفات میں سے نہیں ہے بلکہ آدمی کے ذہن کی صفات میں سے ہے۔ ایک ٹیڑھے ذہن کا آدمی سیدھی سے سیدھی بات میں سے بھی کوئی نہ کوئی ٹیڑھ نکال ہی لیتا ہے اس وجہ سے اس بات کے کہنے کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ ثالثاً شک و شبہ کا سوال درحقیقت پیدا کسی دعوے سے متعلق ہوتا ہے، یہاں دعویٰ یہ ہے کہ یہ کتاب الٰہی ہے۔ اس وجہ سے اگر شک کی نفی کی ضرورت ہے تو اس دعویٰ سے متعلق ہے نہ کہ کتاب سے متعلق۔ رابعاً کتاب سے متعلق شک کی نفی سے کتاب کی شان میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوتا کیونکہ اس طرح کے شک کی نفی ریاضی یا اقلیدس کی کسی کتاب کے بارہ میں بھی کی جا سکتی ہے۔ خامساً قرآن کے ابتدائی مخاطبین کی اصلی الجھن یہ نہیں تھی کہ قرآن کی کچھ باتیں ان کو مشکوک و مشتبہ معلوم ہوتی تھیں بلکہ ان کی اصلی الجھن یہ تھی کہ اس کتاب کو اللہ کی اتاری ہوئی بتایا جاتا تھا اور وہ اس کو اللہ کی اتاری ہوئی ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ سادساً اگر کتاب سے متعلق شک کی نفی کر بھی دی جائے تو اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ اس کے خدا کی طرف سے ہونے کا مسئلہ پھر بھی مشکوک ہی رہا۔ ہاں اس کا خدا کی طرف سے ہونا غیر مشکوک ہو جائے تو پھر اس کا ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہونا آپ سے آپ ثابت ہو جاتا ہے۔

هُدًى کی تحقیق

هُدًى: هُدًى کا لفظ عربی زبان میں بھی اور قرآن مجید میں بھی کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ جن معانی کے نظائر خود قرآن میں موجود ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ قلبی نور و بصیرت۔ مثلاً وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (۱۷۔ محمد) (اور جو لوگ ہدایت کی راہ اختیار کرتے ہیں اللہ ان کی قلبی بصیرت میں اضافہ فرماتا ہے)

۲۔ دلیل و حجت اور نشانِ راہ۔ مثلاً أَوْ أَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى (۱۰۔ طٰہٰ) (یا مجھے آگ کے پاس پہنچ کر کوئی نشانِ راہ مل جائے)۔ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُنِيرٍ (۸۔ حج) (بغیر کسی علم، بغیر کسی دلیل اور بغیر کسی روشن کتاب کے)

۳۔ سیدھا اور صاف راستہ۔ مثلاً إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُسْتَقِيمٍ (۶۷۔ حج) (بے شک تم ایک سیدھے راستے پر ہو) یہیں سے یہ لفظ طریقہ اور شریعت کے معنی میں استعمال ہوا۔ اس معنی کی مثالیں بھی قرآن میں موجود ہیں مثلاً فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (۹۰۔ انعام) (پس ان کے طریقہ کی پیروی کر) إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَى اللَّهِ (۷۳۔ آل عمران) (اور شریعت تو بس اللہ کی شریعت ہے)

۴۔ فعلِ ہدایت۔ مثلاً لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ (۲۷۲۔ بقرہ) (تمہارے ذمہ ان کو ہدایت دینا نہیں ہے بلکہ اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے)

قرآن مجید ظاہر ہے کہ ان چاروں معنوں کے اعتبار سے ھدی ہے۔

متقی کا مفہوم

لِلْمُتَّقِينَ: حرف لام یہاں انتفاع کے مفہوم میں ہے، یعنی اس کتاب سے فائدہ وہی لوگ اٹھائیں گے جو متقی ہیں۔ جس طرح سورج چمکتا تو سب کے لیے ہے لیکن اس سے فائدہ وہی لوگ اٹھاتے ہیں جو آنکھیں رکھتے بھی ہیں اور جو ان آنکھوں کو دیکھنے کے لیے کھولتے بھی ہیں۔ اسی طرح یہ کتاب اتری تو سب ہی کی ہدایت کے لیے ہے لیکن چونکہ اس سے فائدہ فی الحقیقت وہی لوگ اٹھائیں گے جن کے اندر خدا کا خوف ہو، اس وجہ سے فرمایا کہ یہ متقین کے لیے ہدایت ہے۔

متقی کا لفظ اتقاء سے ہے۔ اتقاء کا لفظ قرآن مجید میں کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ہم مثالوں سے اس کی وضاحت کرتے ہیں۔

۱۔ جس چیز سے نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو اس سے بچنا۔ مثلاً فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا (۱۷۔ مزمل) (اگر تم نے کفر کیا تو اس دن سے کیسے بچ سکو گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا)

۲۔ کسی آفت کے ظہور سے اندیشہ ناک رہنا۔ مثلاً وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً (۲۵۔ انفال) (اور اس آفت سے چوکنے رہو جو خاص طور پر انہی پر نہیں آئے گی جنھوں نے تم میں سے ظلم کا ارتکاب کیا ہوگا)

۳۔ اس ربِ قدوس سے برابر لرزتے اور کانپتے رہنا جو اپنے شکر گزار اور وفادار بندوں پر رحم فرماتا ہے، جو کفر و معصیت کو ناپسند کرتا ہے اور جو ہر ظاہر و پوشیدہ سے باخبر ہے۔ وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا (۷۳۔ زمر) (اور جو لوگ اپنے پروردگار سے برابر ڈرتے رہے ان کو گروہ در گروہ جنت کی طرف

لے جایا جائے گا۔

۴۔ اس کا چوتھا مفہوم مذکورہ تینوں مفہوموں کا جامع ہے۔ یعنی گناہ سے اس کے برے نتائج اور خدا کے غضب کے ڈر سے بچتے رہنا۔ جب یہ لفظ مفعول کے بغیر استعمال ہوتا ہے تو عموماً یہی معنی مراد ہوتے ہیں اور اسی چیز کو تقوٰی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وَإِنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا فَلَكُمْ أَجْرٌ عَظِيمٌ (۱۷۹۔ آل عمران)
(اگر تم ایمان لاؤ گے اور تقوٰی اختیار کرو گے تو تمہارے لیے بہت بڑا اجر ہے)

اس تشریح کی روشنی میں متقی وہ شخص ہوگا جس کے دل میں خدا کی عظمت اور اس کے غضب کا خوف سمایا ہوا ہو اور جس کو گناہوں کے نتائج کا پورا پورا احساس ہو۔

تقوٰی میں عمل کی نسبت کیفیت اور حال کا پہلو اور فعل کے بالمقابل ترک کا پہلو اگرچہ زیادہ نمایاں ہے اور اس پہلو سے کہہ سکتے ہیں کہ اس میں نفی اثبات پر غالب ہے لیکن چونکہ یہ دل کی تندرستی کی دلیل ہے اور دل تندرست ہو تو سب کچھ تندرست ہے اس وجہ سے اس سے علم اور عمل دونوں کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ (۳)

ایمان کے معنی

يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ: ایمان، امن سے ہے۔ ایمان کے اصل معنی امن دینے کے ہیں۔ اگر اس کا صلہ لام کے ساتھ آئے تو اس کے معنی تصدیق کرنے اور ب کے ساتھ آئے تو یقین اور اعتماد کرنے کے ہو جاتے ہیں۔ اس لفظ کی حقیقی روح یقین، اعتماد اور اعتقاد ہے۔ جو یقین، خشیت، توکل اور اعتقاد کی خصوصیات کے ساتھ پایا جائے اس کو ایمان کہتے ہیں۔ جو شخص اللہ تعالیٰ پر، اس کی آیات پر، اس کے احکام پر ایمان لائے اور اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر کے اس کے فیصلوں پر پوری طرح راضی اور مطمئن ہو جائے وہ مومن ہے۔

یہ لفظ جب اپنے مفعول کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اس سے خاص اسی چیز پر ایمان لانا مراد ہوتا ہے جس کا اس کے مفعول کی حیثیت سے ذکر ہوتا ہے لیکن اگر مفعول کے بغیر آئے تو اس کے تحت وہ ساری ہی چیزیں آسکتی ہیں جن پر ایمان لانے کا قرآن میں حکم دیا گیا ہے یا جن پر قرینہ دلیل بن سکتا ہے۔

لفظ 'غیب' کی تحقیق

'غیب' کا لفظ قرآن مجید میں مندرجہ ذیل معنوں میں آیا ہے۔

وہ جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو۔ اس کا مد مقابل لفظ شہادت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان چیزوں سے بھی باخبر ہے جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں اور ان چیزوں سے بھی باخبر ہے جو ہمارے سامنے ہیں۔

وہ چیز جس کے جاننے کا آدمی کے پاس کوئی ذریعہ نہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآن میں نقل ہے وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ (۱۸۸۔ اعراف) (اگر مجھے غیب کا پتہ ہوتا تو میں خیر میں بہت سا اضافہ کر لیتا)

وہ جگہ جو آدمی کے سامنے نہ ہو یا وہ سمت جو متعین نہ ہو رہی ہو۔ ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ

اِلَیْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ (۱۰۲- یوسف) (یہ غیب کے واقعات میں سے ہے جن کو ہم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں اور جب وہ اپنے فیصلہ پر متفق ہوئے تو تم ان کے پاس موجود نہ تھے)

راز کے معنی میں بھی اس لفظ کا استعمال عام ہے۔ مثلاً نیک بیبیوں کی تعریف میں آتا ہے۔ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ (وہ راز کی حفاظت کرنے والیاں ہیں)

بِالْغَیْبِ میں 'ب' ظرفیت کی ہے: "بِالْغَیْبِ" کی ب کے بارہ میں بھی دو رائیں ہو سکتی ہیں۔

ایک یہ کہ اس کو ظرف کے معنی میں لیا جائے یعنی وہ غیب میں ہوتے ہوئے ایمان لاتے ہیں۔ اس معنی کی متعدد مثالیں قرآن میں موجود ہیں۔ مثلاً اَلَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ (۴۹- انبیاء) (جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں غیب میں ہوتے ہوئے اور قیامت سے ڈرنے والے ہیں) اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ (۱۸- فاطر) (تم انہی کو ڈرا سکتے ہو جو غیب میں ہوتے ہوئے اپنے رب سے ڈریں اور نماز قائم کریں)

اس صورت میں یُؤْمِنُوْنَ عام رہے گا اور وہ تمام چیزیں اس کے تحت آسکیں گی جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ایمان لانے کے لیے وہ اس بات کے منتظر نہیں ہیں کہ تمام حقائق کا آنکھوں سے مشاہدہ کرلیں، بلکہ وہ مشاہدہ کے بغیر محض عقل و فطرت کی شہادت اور پیغمبرؐ کی دعوت کی بنا پر ان تمام چیزوں پر ایمان لاتے ہیں جن پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ سلف میں سے ربیع بن انس نے یہی تاویل اختیار کی ہے اور ہم نے بھی ترجمہ میں اسی کو ترجیح دی ہے۔

دوسری رائے یہ ہو سکتی ہے کہ اس کو صلہ کی "ب" مانا جائے اور بِالْغَیْبِ کو یُؤْمِنُوْنَ کا مفعول قرار دیا جائے۔ یہ رائے اگرچہ اکثریت کی رائے ہے، اور زبان کے اعتبار سے اس میں کوئی نقص بھی نہیں ہے لیکن مندرجہ ذیل وجوہ سے ہمیں یہ رائے کچھ زیادہ قوی نہیں معلوم ہوتی۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس صورت میں ایمان صرف غیب کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ جاتا ہے۔ غیب کے سوا بقیہ ساری چیزیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے، ایمان کے دائرہ سے باہر ہی رہ جاتی ہیں۔ برعکس اس کے پہلی صورت میں وہ تمام چیزیں ایمان کے دائرہ میں آجاتی ہیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے اور جن کی قرآن نے دوسرے مواقع پر تفصیل بیان کر دی ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ لفظ غیب کا اطلاق چاہے ان تمام چیزوں پر ہوتا ہو جن پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن نبی اور کتاب پر تو اس کا اطلاق بہر حال نہیں ہوتا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ دونوں چیزیں جن پر اللہ تعالیٰ کے بعد ایمان لانا سب سے زیادہ ضروری ہے یہاں ایمان سے کیوں خارج کر دی گئیں ہیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ غیب کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی نہیں بولا گیا ہے۔ غیب اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے نہیں ہے۔ اس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ یہاں اللہ تعالیٰ بھی ایمان کے اجزاء میں

شامل نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ بھی ایمان کے اجزاء میں شامل نہیں ہے تو ایمان بالغیب کے تحت صرف آخرت اور فرشتوں پر ایمان لانا ضروری ٹھہرتا ہے یا زیادہ سے زیادہ مستقبل کے حوادث پر۔ آخر ایمان کے دائرہ کو اس قدر محدود کر دینے کی کیا وجہ ہے؟

چوتھی وجہ یہ ہے کہ یہ دوسری تاویل لینے والے حضرات کہتے ہیں کہ غیب سے مراد احوالِ آخرت ہیں۔ اگر احوالِ آخرت ہی مراد ہیں تو آخرت کا ذکر تو آگے اسی سلسلہ میں مستقل طور پر آ ہی رہا ہے، فرمایا ہے۔ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (اور آخرت پر بھی لوگ یقین رکھتے ہیں) آخر ایک ہی سلسلہ میں ایک ہی بات کو اس طرح دہرانے کی کیا ضرورت تھی؟

پانچویں وجہ یہ ہے کہ پہلی تاویل سے ایک بہت بڑی حقیقت سامنے آتی ہے جس سے یہ دوسری تاویل بالکل خالی ہے۔ وہ یہ کہ ایمان یا خشیت وہی معتبر ہے جو بصیرت اور تقویٰ سے پیدا ہو، جو ایمان یا خشیت گناہوں کے نتائج سامنے آجانے کے بعد پیدا ہو خدا کے ہاں اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ جو لوگ خدا کا عذاب دیکھ کر ایمان لائے ان کے بارہ میں اس کا ارشاد یہ ہے، اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ (تو کیا پھر جب عذاب آنازل ہی ہوگا تب ہی اس کو مانو گے؟ اس وقت ہم کہیں گے اب! حالانکہ اس کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے تھے) (۵۱۔ یونس)

ظرفیت کے مفہوم کے خلاف ایک بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ جہاں جہاں بھی، قرآن میں لفظ ایمان کے ساتھ "ب" آئی ہے کہیں بھی ظرفیت کے مفہوم میں نہیں آئی ہے، لیکن یہ بات کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ اس کے جواب میں بالکل اسی کے برابر کی بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ بالغیب کا لفظ قرآن میں جہاں جہاں بھی آیا ہے ظرف ہی کے طور پر آیا ہے، کہیں بھی مفعول کے طور پر نہیں آیا ہے۔ اس وجہ سے جہاں تک قرآن کے نظائر کا تعلق ہے وہ ظرفیت کے مفہوم کے حق میں زیادہ نمایاں ہیں۔

'اقامتِ صلوٰۃ' کا مفہوم

يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ: اقامت کے معنی کسی چیز کو کھڑے کرنے یا اس طرح سیدھے کرنے کے ہیں کہ اس میں کوئی ٹیڑھ باقی نہ رہ جائے۔ فرمایا ہے وہ نماز قائم کرتے ہیں، یہ نہیں کہا ہے کہ وہ نماز پڑھتے ہیں۔ قرآن نے نماز کے لیے قائم کرنے کا لفظ استعمال کر کے ایک ہی ساتھ کئی حقیقتوں کی طرف توجہ دلا دی ہے۔

پہلی چیز جس کی طرف یہ لفظ متوجہ کرتا ہے وہ نماز میں اخلاص ہے یعنی نماز صرف اللہ ہی کے لیے پڑھی جائے کسی اور کو اس میں شریک نہ کیا جائے۔ اس کے اندر سیدھے کرنے کا جو مفہوم ہے اس کا تقاضا اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک یہ پوری یکسوئی کے ساتھ اللہ ہی کے لیے نہ پڑھی جائے۔ دوسرے مقام پر یہ حقیقت واضح لفظوں میں بھی بیان کر دی ہے۔ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (۲۹۔ اعراف) (اور اسی کی طرف اپنے رخ کرو ہر مسجد کے پاس اور اسی کو پکارو اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے)

یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ نماز میں رُخ قبلہ کی طرف ہونا چاہیئے کیونکہ وہی توحید اور اخلاص کا مرکز ہے۔
دوسری چیز جس کی طرف یہ لفظ اشارہ کرتا ہے وہ نماز کے اصل مقصود پر دل کو پوری طرح جمانا ہے۔ نماز کا اصل مقصود ذکرِ الٰہی میں خشوع و خضوع ہے، اگر آدمی اس چیز سے غافل ہو کر نماز پڑھے تو یہ نماز کو قائم کرنا نہیں ہوا بلکہ محض چھڑا اتارنا ہوا اس حقیقت کی طرف بھی قرآن نے بعض مقامات میں توجہ دلائی ہے۔ مثلاً وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ (۲۰۔ طٰہٰ) (اور نماز کو میرے ذکر کے لیے قائم کرو) دوسری جگہ فرمایا ہے۔ قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ ھُمۡ فِیۡ صَلَاتِھِمۡ خٰشِعُوۡنَ (۱-۲ - مومنون) (ان مومنوں نے فلاح پائی جو اپنی نمازیں خضوع و خشوع سے ادا کرتے ہیں)
تیسری چیز یہ ہے کہ نماز بغیر کسی کمی بیشی کے اس طریقے کے مطابق ادا کی جائے جس طریقہ پر اللہ تعالےٰ نے اس کو ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے، فَاِذَاۤ اَمِنۡتُمۡ فَاذۡکُرُوا اللّٰہَ کَمَا عَلَّمَکُمۡ (۲۳۹۔ بقرہ) (پس جب تم امن میں ہو جاؤ تو اس طریقہ پر اللہ کو یاد کرو جو طریقہ اس نے تم کو سکھایا ہے)
نماز کی صفوں کا ٹھیک کرنا اور ارکانِ نماز کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا بھی اس میں شامل ہے، اسی وجہ سے حدیث میں آیا ہے کہ تسویۃ الصفوف من اقامۃ الصلوٰۃ (صفوں کو برابر کرنا بھی اقامت صلوٰۃ کا ایک جزو ہے)
چوتھی چیز اوقاتِ نماز کی پوری پوری پابندی ہے، فرمایا ہے۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ وَ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ (۸۰ - اسراء) (اور نماز قائم کرو سورج کے زوال کے وقت سے لے کر رات کے تاریک ہونے تک اور صبح کے وقت کا قرآن پڑھنا)
اسی چیز کو دوسرے مقامات میں نمازوں کی نگرانی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حٰفِظُوۡا عَلَی الصَّلَوٰتِ (۲۳۸۔ بقرہ)
پانچویں چیز نماز پر قائم رہنا ہے جیسا کہ فرمایا ہے۔ ھُمۡ عَلٰی صَلَاتِھِمۡ دَآئِمُوۡنَ (۲۳۔ معارج) (وہ اپنی نمازوں پر برابر قائم رہتے ہیں)
چھٹی چیز جمعہ و جماعت کا قیام و اہتمام ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جب امت یا امام کی طرف اس کی نسبت کی جاتی ہے تب تو واضح طور پر جمعہ و جماعت کا قیام و اہتمام ہی مد نظر ہوتا ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو۔ اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰھُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ نَھَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ (اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے) (۴۱۔ حج) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا جس میں انہوں نے اپنی ذریت کا مشن بتایا ہے، ان الفاظ میں نقل ہوتی ہے۔ رَبَّنَاۤ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ (۳۷۔ ابراھیم) (اے ہمارے رب میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو اس بن کھیتی کی زمین میں تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے، اے ہمارے رب، تاکہ یہ نماز قائم کریں)

لفظ صلوٰۃ کی حقیقت

"صلوٰۃ" کا لفظ اصل لغت میں کسی شے کی طرف متوجہ ہونے کے لیے آیا ہے۔ پھر یہیں سے یہ لفظ رکوع کے معنی میں اور پھر تعظیم و تضرع اور دعا کے معنوں میں استعمال ہوا۔ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ لفظ عبادت کے معنی میں بہت قدیم ہے۔ کلدانی میں دعا اور تضرع کے معنی میں اور عبرانی میں رکوع اور نماز کے معنی میں یہ استعمال ہوا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ ایک اصطلاح کی حیثیت سے استعمال ہوا ہے جس کی وضاحت قرآن نے بھی کر دی ہے اور سنت نے بھی اس کی پوری وضاحت کی ہے۔ علاوہ ازیں امت کے قولی و عملی تواتر نے اس کی شکل و ہیئت اور اس کے اوقات بالکل محفوظ رکھے ہیں۔ اگر اس کے کسی جزو میں کوئی اختلاف ہے تو وہ محض فروعی قسم کا ہے جس سے اصل حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (۴)

'ایمان' اور 'ایقان' کے درمیان فرق

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ: آخرت سے مراد دارِ آخرت یا حیاتِ آخرت ہے۔ آخرت کے لیے یہاں ایمان کے بجائے ایقان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ایمان اور ایقان کے درمیان تھوڑا سا فرق ہے جس کو سمجھ لینا چاہیے۔ ایمان کے معنی تصدیق کرنے اور مان لینے کے ہیں۔ اس کا ضد کفر و انکار اور تکذیب ہے۔ ایقان کے معنی یقین کرنے کے ہیں۔ اس کا ضد گمان اور شک ہے۔ جس طرح کسی شے پر یقین رکھنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی اس پر ایمان بھی رکھتا ہو۔[۱] اسی طرح کسی چیز پر ایمان رکھنے کے لیے اس پر یقین کرنا شرط نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آدمی کا ایمان محض گمان غالب پر مبنی ہو اور وہ آہستہ آہستہ گمان کی منزل سے نکل کر یقین کی منزل تک پہنچے اور اس طرح اس کے ایمان کی تکمیل ہو جائے۔ یہاں ایقان کا ذکر ایمان اور ایمان کے چند معروف عملی مظاہر کے بعد ہوا ہے جس سے اس بات کا اشارہ نکلتا ہے کہ جو لوگ مذکورہ اوصاف کے حامل ہیں درحقیقت وہی لوگ ہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۖ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵)

ھُدٰی کا مفہوم

عَلٰى هُدًى: ھدی کے مختلف معانی اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں مذکورہ معانی میں سے نور و بصیرت کے معنی بھی لیے جا سکتے ہیں اور صراط مستقیم کے معنی بھی لیے جا سکتے ہیں۔ ان دونوں معنوں میں سے جو معنی بھی لے لیا جائے آیت کی تاویل ٹھیک بن جاتی ہے اور لغت اور استعمالاتِ قرآن سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

الْمُفْلِحُوْنَ: اس لفظ کی اصلی روح انشراح اور انکشاف ہے اور اس سے مراد وہ فائز المرامی اور کامیابی ہوتی ہے جو اگرچہ حاصل تو ہو ایک صبر آزما اور جاں گسل جد و جہد کے بعد لیکن جب حاصل ہو تو محنت کرنے والے نہال ہو جائیں اور ان کی توقعات کے سارے پیمانے اس کے ناپنے سے قاصر رہ جائیں۔

---

[۱] حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو نشانیاں دکھائیں فرعون کو پورا یقین تھا کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں لیکن اس یقین کے باوجود وہ ان پر ایمان نہیں لایا۔

۲- مجموعۂ آیات ۱-۵ کے مطالب پر ایک سرسری نظر

مذکورہ بالا آیات کے اندر جو باتیں، جس ترتیب کے ساتھ کہی گئی ہیں، پہلے ہم اجمال کے ساتھ ان کو سامنے رکھیں گے اس کے بعد ان کے عمیق اور گہرے پہلوؤں پر غور کریں گے اور جو سوالات یہاں پیدا ہوتے ہیں ان کے جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

یہاں سورہ کا نام ذکر کرنے کے بعد سب سے پہلے وہ دعویٰ سامنے رکھ دیا گیا ہے جس کو اس سورہ کا عمود یا مرکزی مضمون ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ اس سورہ کا مرکزی مضمون نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن پر ایمان لانے کی دعوت ہے۔ چنانچہ یہاں سب سے پہلے جو بات کہی گئی ہے وہ یہی ہے کہ یہ کتاب الٰہی ہے۔ پھر یہ بات واضح کی گئی ہے کہ جہاں تک اس کتاب کے کتاب الٰہی ہونے کا تعلق ہے یہ چیز کسی خارجی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔ یہ کتاب خود اپنے کتاب الٰہی ہونے پر ایک حجت قاطع ہے لیکن اس پر ایمان لانا ہر شخص کے لیے آسان نہیں ہے۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح کے لوگ اس کتاب پر ایمان لائیں گے اور کس طرح کے لوگ اس سے محروم رہیں گے۔ ایمان لانے کے لیے بنیادی چیز قلب کی صلاحیت کو قرار دیا گیا ہے جس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہوگئی ہے کہ جن لوگوں کے دل صلاحیت سے خالی ہیں وہ اس کتاب سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہوگئی ہے کہ یہ صلاحیت تقویٰ، خشیت اور خدا ترسی سے پیدا ہوتی ہے۔

اس کے بعد اس تقویٰ سے علم وعمل کی جو برکتیں پیدا ہوتی ہیں ان کا ذکر فرمایا ہے۔

اس تقویٰ کا پہلا ثمرہ ایمان بالغیب بتایا گیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جس کے دل میں صلاحیت ہو اس کی عقل دوربین اور دوررس ہو جاتی ہے۔ وہ حیوانات کی طرح صرف محسوسات و مادیات ہی میں گرفتار نہیں رہتا بلکہ وہ ان حقیقتوں کو بھی مانتا ہے جو اگرچہ آنکھوں سے دیکھی نہ جا سکتی ہوں، لیکن عقل سلیم ان کی شہادت دے رہی ہو۔ وہ ان حقیقتوں کو اسی طرح مانتا ہے جس طرح آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی حقیقتیں مانی جاتی ہیں، بلکہ جو یقین اس کو ان نادیدہ حقیقتوں پر ہوتا ہے، بسا اوقات وہ یقین اس کو ان چیزوں پر بھی نہیں ہوتا جو اس نے آنکھوں سے دیکھی اور کانوں سے سنی ہوتی ہیں۔

اس کے بعد بعض وہ اعمال وعقائد بیان ہوئے ہیں جو اس ایمان بالغیب سے لازماً پیدا ہوتے ہیں۔

ایمان محض کسی تصور کا نام نہیں ہے بلکہ اس کی اصل حقیقت وہ تصدیق ہے جو دل کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہوتی ہے اور جو آدمی کے ارادہ کو حرکت میں لاتی ہے۔ یہ ارادہ آدمی کو بہت سے کاموں کے کرنے اور بہت سی چیزوں کے چھوڑنے کے لیے اٹھا کھڑا کرتا ہے۔ یہاں کرنے کے کاموں میں سے دو ہی کاموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک نماز قائم کرنے کا، دوسرے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا۔ اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں کام دوسری

تمام نیکیوں کی جڑ اور تمام بھلائیوں کی بنیاد ہیں۔ چنانچہ آگے ہم وضاحت کے ساتھ بتائیں گے کہ درحقیقت یہی دو بنیادی نیکیاں ہیں جن پر پورا دین قائم ہے۔

انفاق کے ذکر کے ساتھ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ (اس میں سے جو ہم نے ان کو بخشی ہیں) کے الفاظ فرما کر کئی باتوں کی طرف اشارہ کر دیا۔

ایک تو یہ کہ خدا کی راہ میں اسی کا بخشا ہوا مال خرچ کرنا درحقیقت بندہ کی طرف سے اس مال کے عطیۂ الٰہی ہونے کا اعتراف ہے۔

دوسرے اس سے خرچ کرنے کی ایک مؤثر دلیل سامنے آگئی۔ وہ یہ کہ خدا کے بخشے ہوئے مال کا کچھ حصہ اس لیے اس کی راہ میں خرچ کرنا چاہیے کہ اس کی شکر گزاری کا حق ادا ہو سکے۔

تیسرے اس وضاحت نے انفاق کے مشکل کام کو یک گونہ سہل بھی بنا دیا کیونکہ جو کچھ اس نے دیا ہے اس سارے کے لیے اس کا مطالبہ نہیں ہے بلکہ اس میں سے صرف ایک قلیل حصہ ہی ہے جو اس کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ یہاں زکوٰۃ کے بجائے انفاق کا لفظ ہے جو اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے۔ یہ لفظ صدقات و خیرات کی ساری ہی قسموں پر حاوی ہے۔

اس کے بعد ان متقین کے ایک خاص وصف کو خاص طور پر نمایاں کر کے بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ یہ لوگ ہر قسم کے گروہی تعصبات سے پاک اور جمود و تقلید کی تمام بندشوں سے بالکل آزاد ہیں۔ وہ خدا کی اتاری ہوئی کتابوں اور اس کے بھیجے ہوئے رسولوں میں کوئی تفریق اور امتیاز نہیں کرتے۔ وہ اس سارے پر ایمان لاتے ہیں جو خدا کی طرف سے اترا ہے، خواہ وہ ان کی اپنی قوم کے کسی رسول پر اترا ہے یا کسی دوسری قوم کے رسول پر، ان کو اگر بحث ہوتی ہے تو صرف اس چیز سے ہوتی ہے کہ بات خدا کی اتاری ہوئی ہو، یہ نہ ہو کہ کسی غیر خدا کی بات خدا کی طرف منسوب کر دی گئی ہو یا کوئی بات باہر سے لا کر خدا کی بات میں ملا دی گئی ہو۔

اس کے بعد فرمایا کہ حقیقت میں آخرت پر ایمان اور یقین رکھنے والے لوگ یہی ہیں۔

جہاں تک آخرت پر ایمان کا تعلق ہے وہ ایمان بالغیب میں شامل تھا، اس کے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں خاص طور پر اس کو الگ ذکر کرنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ایمان بالآخرت کے مدعی تو بہت سے ہو سکتے ہیں لیکن جو لوگ نماز قائم کرتے ہیں، جو خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جو خدا کی اتاری ہوئی ہر کتاب پر ایمان لاتے ہیں، درحقیقت وہی لوگ ہیں جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ یہی لوگ، جن کے اوصاف بیان ہوئے ہیں، اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور انھی کے لیے مزید ہدایتوں کے دروازے کھلیں گے۔ نیز یہی اس دنیا میں ہدایت پر ہیں اور انھی کے لیے آخرت میں فوز و فلاح ہے۔

۳- بعض اشارات وکنایات

قرآن نے یہ بتانے کے بعد کہ یہ کتاب خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ہدایت ہے، ان لوگوں کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے، جو اس لفظ کے اُس زمانہ میں مصداق بن سکتے تھے۔ یہ اشارہ اس طرح کیا ہے کہ ان کی کچھ نمایاں خصوصیات بیان کر دی ہیں۔ ان خصوصیات پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ ان مسلمانوں کی خصوصیات ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ اس سے یہ اشارہ نکلا کہ ان لوگوں کے اندر تقویٰ اور خشیت کی صفت پہلے سے موجود تھی اس وجہ سے ان کو قرآن سے نفع پہنچا۔ ان کے اندر امی عربوں میں سے جو لوگ شامل ہوئے تھے، یہ وہ لوگ تھے جن کے اندر زمانہ کے عام فساد کے باوجود بہت سی خوبیاں موجود تھیں اور ان کو فطرت کی ہدایت کی جو روشنی ملی تھی اس کو انھوں نے اپنے اندر محفوظ رکھا تھا اسی طرح ان کے اندر اہل کتاب میں سے جو لوگ شامل ہوئے تھے، وہ بھی اپنی اپنی شریعتوں پر اپنے علم کی حد تک نیک نیتی سے عمل کرنے والے تھے اس وجہ سے یہ لوگ مستحق ٹھہرے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی آخری اور کامل ہدایت سے بہرہ ور کرے۔

یہود کی اخلاقی و روحانی بیماریاں

اس تصویر میں مسلمانوں کے جو خط و خال نمایاں کیے گئے ہیں ان پر غور کرنے سے ایک طرف اگر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلمان کے اصلی اوصاف کیا ہیں یا کیا ہونے چاہئیں تو دوسری طرف یہی تصویر ان لوگوں کو بھی سامنے لا کھڑا کرتی ہے جو اس کتاب پر ایمان نہیں لائیں گے۔ ساتھ ہی نہایت خوبی کے ساتھ، اشارات وکنایات کے پردے میں، ان کے ایمان نہ لانے کے اسباب کی طرف بھی اشارے کر دیتی ہے۔ اشارات وکنایات کے اس پردے کو اٹھایئے تو اس کے نیچے سے یہود برآمد ہوتے ہیں جن سے اس سورہ میں، جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، اصلی بحث ہے۔ اپنی جن اخلاقی و روحانی بیماریوں کے سبب سے یہود قرآن کی نعمت سے محروم ہوئے ان کو بے نقاب کرنے کے لیے قرآن نے یہ بلیغ انداز اختیار کیا کہ مسلمانوں کی ان عملی و اعتقادی خصوصیات کو خاص طور پر نمایاں کیا جن کے بالکل ضد خصوصیات یہود نے اپنے اندر جمع کر رکھی تھیں۔ اور جو قبول حق میں ان کے لیے ایسی رکاوٹ بن گئی تھیں کہ ان پر قابو پانا ان کے لیے ناممکن ہو گیا تھا۔

ہم قرآن کے ان لطیف اشارات کی یہاں تھوڑی سی وضاحت کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ جو لوگ قرآن پر ایمان نہیں لا رہے تھے ان کے ایمان نہ لانے کے اسباب کیا تھے۔

قرآن پر ایمان نہ لانے کے

سب سے پہلے هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ کے الفاظ پر غور کیجیے، یہ بات کہ یہ کتاب متقین ہی کے لیے ہدایت ہے یہود کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کے ایک اہم فیصلہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ گوسالہ پرستی کے واقعہ کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہود سے توبہ کرائی اور ان کو تطہیر و تزکیہ کی بعض سخت آزمائشوں

سے گزرا تو اس وقت ان کے لیے انھوں نے یہ دعا بھی فرمائی کہ آئندہ یہ خدا کے غضب سے محفوظ رہیں اور اس کی رحمت سے کبھی محروم نہ ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا اللہ تعالیٰ نے قبول تو فرمائی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آئندہ اس کی جو رحمت، آخری شریعت کی شکل میں، نازل ہونے والی ہے اس سے بنو اسرائیل میں سے صرف وہی لوگ بہرہ یاب ہو سکیں گے جو خدا سے ڈرتے رہیں گے، زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوں گی ان پر ایمان لائیں گے۔ سورۂ اعراف میں جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاریخ دعوت کا یہ واقعہ بیان ہوا ہے مندرجہ ذیل آیت بھی آئی ہے۔ اس آیت پر اس کے سیاق و سباق کو پیش نظر رکھ کر غور کیجیے۔

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۚ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ ۔ الآیہ (اعراف ۷: ۱۵۶-۱۵۷)

اور میری رحمت ہر چیز کو حاوی ہے، پس میں اس کو لکھ رکھوں گا ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ پر قائم رہیں گے، زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور ان لوگوں کے لیے جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے یعنی جو رسول نبی اُمی کی پیروی کریں گے۔

یہ آیت صاف بتاتی ہے کہ قرآن اور اسلام کی نعمت حضرت موسیٰؑ کی قوم میں سے صرف انھی لوگوں کو ملنے والی تھی جو تقویٰ پر قائم رہنے والے، زکوٰۃ ادا کرتے رہنے والے اور اللہ کی آیتوں پر ایمان لانے والے تھے۔ پھر آیت کے آخر میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ تھے جو نبی اُمی کی پیروی کریں۔

بعینہ اسی شرط کو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے الفاظ یہاں یاد دلا رہے ہیں۔ اہل کتاب میں سے جو لوگ اس شرط پر پورے اترے وہ ایمان لائے اور اسی سے یہ بات بھی نکلی کہ جو لوگ اس کتاب پر ایمان نہیں لائے وہ تقویٰ اور خشیت کی اس صفت سے عاری تھے جو اس کتاب پر ایمان لانے کے لیے ضروری ہے۔

ٹھیک اسی طرح کی بات اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی فرمائی تھی۔ ان کو مختلف امتحانوں میں جانچنے کے بعد جب قوموں کی امامت کے منصب پر سرفراز فرمانے کا وعدہ فرمایا تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ یہ منصب میری ذریت کو بھی حاصل رہے گا یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ (۲- بقرہ ۱۲۴) (میرا یہ عہد تمھاری ذریت میں سے ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو ظالم ہوں گے) ظالم سے مراد ظاہر ہے کہ وہ لوگ ہیں جو توحید و اخلاص سے عاری اور تقویٰ و خشیت سے خالی ہوں، خواہ ان کا تعلق حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے ہو یا حضرت اسحاقؑ کی نسل سے۔ ایسے لوگوں کے بارہ میں خود حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی سے اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح فرما دی تھی کہ جس پیغمبر یا جس پیغمبر کی امت کو دنیا کی امامت ملنے والی ہے ظالم لوگ نہ اس پیغمبر پر ایمان لائیں گے اور نہ اس عزت میں حصہ دار ہوں گے جو اس کو اور اس کی امت کو ملنے والی ہے۔

یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کے الفاظ یہود کی اس محسوسات پرستی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جس میں وہ ابتلا سے مبتلا رہے ہیں۔ اپنی اسی بیماری کے سبب سے یہود عین اپنے نبی کی موجودگی میں ایک بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے۔ مصر کے دورِ غلامی میں وہ جس ذہنی و روحانی پستی میں مبتلا ہو گئے تھے اس سے آخر وقت تک ان کو نکلنا نصیب نہ ہوا۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہزاروں معجزات دیکھنے کے بعد بھی ان کا اصرار یہی رہا کہ وہ ایک مرتبہ خود اپنی آنکھوں سے خدا کو دیکھ لیں تب وہ اس بات کو مانیں گے کہ فی الواقع وہ حضرت موسیٰ سے کلام بھی کرتا ہے۔ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (ہم تمہاری بات اس وقت تک باور نہیں کریں گے جب تک ہم خود بھی خدا کو کھلم کھلا نہ دیکھ لیں) (۵۵۔ بقرہ) اسی طرح کی بات مشرکینِ مکہ بھی کہتے تھے۔ ان کا اعتراض بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ تھا کہ اگر اللہ آپ سے کلام کرتا ہے تو آخر ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا؟ قرآن نے یہ کہہ کر کہ اس کتاب پر وہی لوگ ایمان لائیں گے جو غیب میں رہتے ایمان لائیں، گویا دوسرے الفاظ میں یہ اعلان کر دیا کہ جو لوگ خدا کو چھو کر اور ٹٹول کر اور تمام حقائق کا سر کی آنکھوں سے مشاہدہ کر کے ایمان لانا چاہتے ہیں ان کے لیے قرآن میں کوئی حصہ نہیں ہے، قرآن کا فیض صرف ان معقول لوگوں کو پہنچے گا جو حواسِ ظاہری سے زیادہ عقل پر بھروسہ کرتے ہیں۔

ایمان لانے والوں کی یہ تعریف کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں، یہود اور ان کے دوسرے ساتھیوں کی اس حالت پر تعریض ہے جس کا ذکر قرآن نے دوسری جگہ ان الفاظ میں فرمایا ہے۔ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۵۹۔ مریم) (پھر ان کے بعد ان کے ایسے جانشین آئے جنھوں نے نماز ضائع کر دی اور شہوتوں کے پیچھے پڑ گئے تو جلد وہ اپنی گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے)

اہلِ ایمان کے انفاق کے ذکر میں یہود اور ان کے جتھہ کے دوسرے ساتھیوں کی اس بخالت اور اس زر پرستی پر تعریض ہے جو ہمیشہ سے ضرب المثل رہی ہے۔ قرآن کے زمانۂ نزول میں ان کے عوام تو درکنار ان کے علماء اور صوفیا کا جو حال تھا اس کی تصویر قرآن نے ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا	اے ایمان والو! بہت سے فقیہ اور صوفی لوگوں
مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ	کے مال باطل طریقوں سے ہڑپ کرتے ہیں اور
اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ	اللہ کے رستہ سے لوگوں کو روکتے ہیں اور جو لوگ سونے
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ	اور چاندی کے ڈھیر اکٹھے کر رہے ہیں اور ان کو

---

[1] سورہ بقرہ کی آیت ۸۳ میں نہایت واضح الفاظ میں یہود کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ ان سے نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دیتے رہنے کا جو عہد لیا گیا تھا وہ عہد انھوں نے توڑ ڈالا۔

وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِيْلِ	اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کر رہے ہیں ان کو دردناک
اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۳۴- توبہ)	عذاب کی خوشخبری سنادو۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ الآیۃ میں یہود کے اس گروہی تعصب پر تعریض ہے جو ان کے لیے قرآن پر ایمان لانے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا تھا۔ یہود کو جب دعوت دی جاتی کہ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی آخری کتاب۔ قرآن، پر ایمان لاؤ تو وہ کہتے کہ جو کتاب ہم پر اتری ہے ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اس پر ایمان رکھنا ہمارے لیے کافی ہے۔ اس کے بعد ہم کسی اور کتاب اور قرآن کے قائل نہیں ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ	اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اس
اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ	چیز پر جو اللہ نے اتاری ہے تو کہتے ہیں ہم اس
اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا	چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اتاری گئی ہے۔
وَرَآءَهٗ ۚ (۹۱- بقرہ)	اس کے بعد جو کچھ ہے اس کا وہ انکار کرتے ہیں۔

اہل ایمان کی یہ تعریف کہ آخرت پر وہی یقین رکھتے ہیں، آخرت کے بارے میں یہود کی اس بےیقینی کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس کی شہادت ان کی عملی زندگی کے ہر گوشے سے مل رہی تھی۔ یوں تو وہ آخرت پر نہ صرف ایمان کے مدعی تھے بلکہ ان کا دعویٰ تو یہ تھا کہ آخرت کی ساری کامیابیاں تنہا انھی کا حصہ ہیں۔ لیکن دوسری طرف زندگی اور اسباب زندگی کی محبت میں اس قدر غرق تھے کہ ان مشرکین کو بھی مات کر گئے تھے جو آخرت کا تصور یا تو سرے سے رکھتے ہی نہیں تھے یا رکھتے تھے تو نہایت مبہم اور دھندلا۔ مشرکین ہی کی طرح انھوں نے بھی غلط قسم کی شفاعت کا تصور قائم کر لیا تھا اور اس وہم میں مبتلا ہو گئے تھے کہ دوزخ میں اول تو وہ ڈالے ہی نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے بھی گئے تو چند دنوں سے زیادہ کے لیے نہیں۔ ظاہر ہے کہ آخرت پر اس طرح کا ایمان ایک بالکل بےمعنی ایمان ہے۔ چنانچہ قرآن نے ان کے اس ایمان کی قلعی اس طرح کھولی ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ	کہہ دو کہ اگر آخرت کی کامیابی دوسروں کے مقابل
عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ	میں خاص کر تمہارا ہی حصہ ہے تو موت کی آرزو
فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝	کرو اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو اور وہ اپنی
وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتْ	کرتوتوں کے سبب سے ہرگز موت کی تمنا نہیں
اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝	کریں گے۔ اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ تم
وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى	ان کو زندگی کا سب سے زیادہ حریص پاؤ گے۔
حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا (۹۴-۹۶- بقرہ)	ان سے بھی زیادہ جو مشرک ہیں۔

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ متقین کے ذکر کے بعد ان متقین کی جو تصویر قرآن نے پیش کی ہے اس سے

ایک طرف تو وقت کے اہلِ ایمان سامنے آگئے اور یہ معلوم ہوگیا کہ یہ لوگ تھے جن کے اندر تقویٰ اور خشیت کی فطری صلاحیتیں موجود تھیں اس وجہ سے ان کو قرآن پر ایمان لانے کی توفیق نصیب ہوئی۔ دوسری طرف اسی تصویر نے یہود اور ان کے حلیفوں کو سامنے لاکھڑا کیا ہے کہ یہ لوگ ہیں جو خدا کے خوف اور اس خوف کی تمام برکتوں سے خالی ہیں، اس وجہ سے یہ قرآن کی دعوت کو قبول نہیں کریں گے۔

ان چند الفاظ کے اندر اتنی لمبی تفصیل کو چھپا دینا اور یہود کا نام لیے بغیر ان کو اس طرح بے نقاب کر دینا قرآنی بلاغت کا اعجاز ہے۔

۴۔ چند سوالات اور ان کے جوابات

ان آیات پر جو شخص بھی تدبر کی نگاہ ڈالے گا اس کے ذہن میں چند سوالات ضرور پیدا ہوں گے۔

ایک یہ کہ یہاں قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کا دعویٰ محض ایک دعوے کی شکل میں رکھ دیا گیا ہے، اس کی کوئی دلیل نہیں دی گئی ہے، حالانکہ جب یہی بات اس سورہ کا عمود ہے تو اس کو صرف ایک دعوے کی شکل میں رکھ دینا کافی نہیں تھا، بلکہ نہایت مضبوط دلائل سے اس کو ثابت کرنا تھا۔

دوسرا یہ کہ اس کتاب کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ یہ متقیوں اور پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے۔ "یہ کتاب متقیوں ہی کے لیے ہدایت ہے تو پھر اس کے اترنے کا فائدہ کیا ہوا؟ ضرورت تو تھی کہ اس کی برکت سے جو بدکار تھے وہ پرہیزگار اور جو گنہگار تھے وہ نیکوکار بنتے لیکن جب بیماروں کو شفا دینے کے بجائے یہ تندرستوں ہی کو تندرست بنانے آئی ہے تو اس کا نازل ہونا تو تحصیل حاصل ہی رہا۔

تیسرا یہ کہ متقین کی پہلی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ ایمان بالغیب لاتے ہیں۔ ایمان بالغیب کے متعلق عام خیال تو یہ ہے کہ یہ محض عامیانہ تقلید یا ذہنی پن یا خوش عقیدگی سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن اپنی تاثیر کا جوہر صرف انھی پر دکھا سکتا ہے جو ذہنی اور خوش عقیدہ قسم کے لوگ ہوں، سوچنے سمجھنے اور غور و فکر سے کام لینے والوں پر اس کا بیان یا استدلال کارگر نہیں ہو سکتا۔

چوتھا یہ کہ یہاں متقین کی چند صفات بھی گنائی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ ایمان بالغیب لاتے ہیں، وہ نماز قائم کرتے ہیں، وہ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، وہ خدا کی اتاری ہوئی ہر کتاب پر ایمان لاتے ہیں، وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ یہ سارے کام کر رہے ہیں تو اس کے بعد وہ کون سی ہدایت ہے جس کے یہ محتاج رہ جاتے ہیں اور جو یہ کتاب فراہم کرتی ہے؟ کیا ہدایت ان چیزوں سے بالاتر کسی چیز کا نام ہے جس کا ان سارے کاموں کے کرنے کے بعد بھی آدمی محتاج ہی رہ جاتا ہے؟

پانچواں سوال یہ ہے کہ یہاں ایمان کے بعد عملی نیکیوں میں سے صرف دو ہی کا ذکر کیا گیا ہے، ایک نماز کا، دوسری انفاق کا۔ آخر ان کی اہمیت کا وہ کیا خاص پہلو ہے جس کی وجہ سے ان کا ذکر کیا گیا ہے اور دوسری

کسی نیکی کا ذکر نہیں کیا گیا؟

سوالات تو بعض اور بھی پیدا ہوتے ہیں لیکن ان کا جواب تھوڑے سے غور و فکر سے ہر شخص خود معلوم کر سکتا ہے اس وجہ سے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں۔ البتہ مذکورہ سوالات خاص اہمیت رکھتے ہیں اس وجہ سے ہم ترتیب کے ساتھ ان کے جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن کے مخالفین اگر قرآن کا انکار کر رہے تھے تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ قرآن کا کتاب اللہ ہونا ان پر واضح نہیں تھا، کم از کم سورۂ بقرہ کے زمانہ نزول یعنی اوائل ہجرت میں تو اس کتاب کا کتابِ الٰہی ہونا اہلِ کتاب اور مشرکین سب پہ واضح ہو چکا تھا۔ قبولِ حق میں جو چیز مانع تھی وہ یہ نہیں تھی کہ حق اچھی طرح واضح نہیں تھا بلکہ یہ تھی کہ قبولِ حق کے لیے طبیعتوں میں جس صلاحیت کی ضرورت ہے وہ ان کے اندر موجود نہیں تھی۔ ایسی صورت میں ثابت کرنے کی بات یہ نہیں تھی کہ یہ کتابِ الٰہی ہے اور اس کے کتابِ الٰہی ہونے کی یہ یہ دلیلیں ہیں بلکہ کہنے کی بات یہی تھی کہ یہ کتابِ الٰہی ہے، اس کے کتابِ الٰہی ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے طبیعتوں میں صلاحیت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ قرآن نے یہی کیا ہے۔ یہاں هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کہہ کر اس نے اس شرط کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس کتاب پر ایمان لانے کے لیے ضروری ہے۔ یہ شرط ہے تقویٰ اور خدا ترسی۔ گویا قرآن یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دے رہا ہے کہ نہ قرآن کا کتابِ الٰہی ہونا محتاجِ ثبوت ہے اور نہ تمہارا فرستادۂ الٰہی ہونا۔ یہ بالکل واضح حقیقتیں ہیں لیکن ان حقیقتوں کی وضاحت ان لوگوں کو کیا نفع پہنچا سکتی ہے جن کے سینے خوفِ خدا سے خالی ہیں، جن کی آنکھوں پر محسوسات کی پٹیاں بندھی ہوئی ہیں، جو فطرت کی بنیادی نیکیوں کو بھی ختم کر چکے ہیں اور جن کو تعصب نے بالکل اندھا بہرا بنا دیا ہے۔

علاوہ بریں یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس سورہ میں اصلی خطاب، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یہود سے ہے۔ یہود آخری کتاب اور آخری رسول سے ناآشنا نہیں تھے۔ توریت کی کتاب تثنیہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ ان کے بھائیوں کے اندر سے ان کے لیے ایک نبی بھیجے گا، اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالے گا، اس کے ذریعہ سے شریعت کو کامل کرے گا، اس کے واسطہ سے ان کے دشمنوں سے انتقام لے گا، جو اس کی بات نہ سنیں گے وہ ان کو سزا دے گا، وہ خدا کے نام سے کلام کرے گا، اس کی پیشین گوئیاں سچی ہوں گی اور وہ اس وقت تک دنیا میں رہے گا جب تک اللہ کا کلمہ بلند نہ ہو جائے۔

یہود ان ساری باتوں سے اچھی طرح باخبر بھی تھے اور ان میں سے ایک ایک بات کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور آپ کی زندگی کے حالات نے ثبوت بھی فراہم کر دیا تھا۔ بالخصوص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ ہجرت فرمانے کے بعد تو وہ تمام آثار بالکل سامنے آ چکے تھے، جن کو دیکھ لینے کے بعد یہود کو یقین ہو

چکا تھا کہ توریت کی اس پیشین گوئی کے مصداق درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ پھر یہود اس پیشین گوئی ہی کی بنا پر ایک نبی اور کتاب کے منتظر بھی تھے۔ ایسے حالات کے اندر ذٰلِكَ الْكِتَابُ کا دعویٰ محض دعویٰ نہیں ہے بلکہ یہ الفاظ گویا انگلی اٹھا کر اشارہ کر رہے ہیں کہ یہی موعود کتاب ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، جس کے تم منتظر رہے ہو اور جو ان تمام باتوں کی تصدیق کر رہی ہے جو اس کے بارے میں تمھیں پہلے بتائی جا چکی ہیں۔

اس پس منظر کو سامنے رکھ کر معاملہ پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہاں اس دعوے پر دلیل کی ضرورت نہیں تھی بلکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ یہود اپنے تعصب، اپنی ضد اور اپنے حسد سے باز آئیں اور اس کتاب کو جس کے لیے وہ مدت ہائے دراز سے چشم براہ تھے ہاتھوں ہاتھ لیں اور اس کی برکتوں اور رحمتوں کا تجربہ کریں۔

دوسرے سوال کا جواب اگرچہ پہلے سوال کے جواب کے ذیل میں ایک حد تک آچکا ہے لیکن ہم اس کی مزید وضاحت کیے دیتے ہیں تاکہ اس کے وہ پہلو بھی سامنے آجائیں جو نہیں آسکے ہیں۔

انسان پر کسی چیز کے اثر انداز ہونے کے لیے تنہا یہی بات کافی نہیں ہے کہ وہ چیز بجائے خود مؤثر ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کے اندر اثر پذیری کی صلاحیت بھی موجود ہو۔ سورج لاکھ چمکے لیکن ایک شخص اندھا ہو تو سورج کے چمکنے سے اس کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ چمن میں بلبل ہزار چہکے لیکن اگر ایک شخص بہرا ہے وہ اس کے چہکنے سے کیا لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اسی طرح قرآن کا نور ہونا، بصیرت ہونا، سرچشمہ ہدایت ہونا مسلم، لیکن اگر ایک شخص نے اپنی وہ صلاحیت ہی ضائع کر دی ہے جو اس نور اور اس سرچشمہ ہدایت سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے تو آخر قرآن کیا کرے گا۔ قرآن نے جگہ جگہ فرمایا ہے کہ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰی (اس میں خدا سے ڈرنے والوں کے لیے درس عبرت ہے) (۲۶۔ نازعات) اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰی لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ (بے شک اس کے اندر یاد دہانی ہے اس کے لیے جس کے پاس بیدار دل ہو یا وہ پوری طرح متوجہ ہو کر بات سنے (۳۷۔ ق)

یہ انسان کی اسی فطری صلاحیت کی طرف اشارہ ہے جو قرآن سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے۔ اسی چیز کو یہاں تقویٰ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

تقویٰ کے مختلف مراتب

اس تقویٰ کے کئی درجے ہیں۔ ایک تو وہ تقویٰ ہے جو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت ہے، جس کی طرف قرآن نے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا کے الفاظ سے اشارہ کیا ہے۔ یہ تقویٰ نیکی کی ہر بات اور بھلائی کی ہر دعوت سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک شرط ضروری ہے جس نے اپنے اندر سے یہ تقویٰ ضائع کر دیا گویا وہ اس معقولیت ہی سے خالی ہو بیٹھا جو اس کو نیکی اور بھلائی کی طرف راغب کر سکتی تھی۔ یہ تقویٰ جس طرح انسانیت اور شرافت کے سادے ہی کاموں پر آمادہ کرنے کے لیے ضروری ہے اسی طرح قرآن کی دعوت کی طرف مائل کرنے کے لیے بھی ضروری ہے۔ قرآن چیز ہی ایسی ہے کہ اس کی طرف بے فکرے اور اوباش قسم

کے لوگ متوجہ نہیں ہو سکتے تھے۔ وہی لوگ متوجہ ہو سکتے تھے جن کے اندر نیکی اور شرافت کا جوہر موجود ہو چنانچہ تاریخ کی شہادت بھی یہی ہے کہ قرآن کی دعوت نے عربوں میں سے ان لوگوں کو اپیل کیا جو سنجیدہ اور معقول تھے اور اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو جذب کیا جو متقی اور خدا ترس تھے۔

دوسرا تقویٰ وہ ہے جو قرآن کی پیروی کے نتیجہ اور ثمرہ کے طور پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بھی کئی درجے ہیں، لیکن یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ یہاں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ میں تو اس تقویٰ کی طرف اشارہ ہے جو قرآن سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک شرط ضروری ہے۔ لیکن اس کے بعد الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ سے لے کر وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ تک ان متقین کی جو صفتیں بیان ہوئی ہیں وہ اس تقویٰ کا نتیجہ ہیں جو قرآن کی پیروی سے پیدا ہوا ہے۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ ایمان بالغیب ضعیف الاعتقادی یا وہمی پن کا ثبوت نہیں فراہم کر رہا ہے بلکہ انسان کے عقلی اور روحانی ہستی ہونے کا ثبوت فراہم کر رہا ہے اور قرآن نے اسی پہلو سے اس چیز کا یہاں ذکر کیا بھی ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی تمام تگ و دو بس محسوسات ہی تک محدود ہوتی ہے، اس سے آگے کے لیے نہ ان کے اندر کوئی رغبت ہی ہوتی ہے اور نہ وہ اس سے آگے جانے کی کوئی کوشش ہی کرتے ہیں۔ وہ اپنی عقل کو بھی، جو بلند پروازی کی فطری صلاحیتیں رکھتی ہے، اور جس کا اصلی میدان محسوسات نہیں بلکہ ماورائے محسوسات ہے، انھی محسوسات کے اندر قید کر چھوڑتے ہیں کہ اس کو جتنا زور لگانا ہو انھی کے اندر لگائے، اس سے باہر نکلنے کو وہ بالکل بادپیمائی اور بیہودہ سرائی خیال کرتے ہیں۔

دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے نزدیک حقیقی قدر و قیمت محسوسات و مادیات کی نہیں بلکہ عقل اور اس کے ادراکات کی ہے، وہ عقل ہی کو انسانیت کا خاصہ اور اس کا جوہر سمجھتے ہیں، اسی چیز کو وہ انسان اور حیوان کے درمیان فرق کرنے والی مانتے ہیں اور ان کے دل کی حقیقی خوشی محسوسات کی فانی لذتوں میں نہیں بلکہ عقل کی ان روحانی فتوحات ہی میں ہوتی ہے۔ قرآن نے اسی گروہ کی طرف یہاں يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ کے الفاظ سے اشارہ کیا ہے۔ اس کے نزدیک یہی گروہ ہے جو اس کی بلندیوں کا ساتھ دے سکتا ہے۔ پہلے گروہ کو تو اس نے چوپایوں سے تشبیہ دی ہے بلکہ ان کو چوپایوں سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔ فرمایا ہے۔ أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا (کیا تم گمان کرتے ہو کہ ان میں سے اکثر سنتے اور سمجھتے ہیں، یہ تو بالکل چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے (۴۴۔ فرقان) یعنی جب وہ اپنی عقل جیسی اعلیٰ چیز کو بھی محسوسات ہی کی چاکری میں لگائے ہوئے ہیں تو نہ ان کا سننا سننا ہے اور نہ ان کا سمجھنا سمجھنا۔ یہ تو وہ بے وقوف لوگ ہیں جو ایک تیغ جوہر دار سے وہ کام لے رہے ہیں جو گھاس کاٹنے کی درانتی سے لیا جاتا ہے۔

پس غیب میں رہتے ہوئے ایمان لانے کا مطلب یہ ہوا کہ وہ محض محسوسات کے غلام اور مادیات کے

پرستار نہیں ہیں بلکہ وہ عقل کی رہنمائی میں چلتے ہیں اور جو باتیں عقل سے ثابت ہیں یا فطرت جن کی شہادت دیتی ہے ان کو وہ تسلیم کرتے ہیں اور ان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اپنی جن محسوس اور مادی راحتوں اور لذتوں کو قربان کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے ان کو بے دریغ قربان کر دیتے ہیں۔

چوتھے سوال کا جواب اگرچہ دوسرے سوال کے جواب کے ضمن میں ایک حد تک آگیا ہے لیکن ہم اس کو بھی مزید واضح کیے دیتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ملحوظ رکھنے کی ہے کہ متقین کے بعد متقین کی جو صفات بیان ہوتی ہیں ان کی حیثیت توضیحی صفات کی ہے۔ یعنی اس لفظ کے جو مصداق اس زمانہ میں قرآن کے سامنے تھے قرآن نے بطورِ مثال ان کی طرف انگلی اٹھا دی ہے کہ یہ لوگ ہیں جن کے اندر تقویٰ موجود تھا، چناں چہ دیکھ لو، انھوں نے مجھ سے فائدہ اٹھایا۔ ان صفات کو آپ اس معنی میں نہ لیں کہ یہ سب قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ابتدائی شرائط کی حیثیت رکھتی ہیں بلکہ ان کی حیثیت قرآن کی پیروی کے ثمرات و برکات کی ہے۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کو قرآن نے هُدًى کہا ہے، جس کی وضاحت ہم تفصیل سے اس کے مقام میں کر چکے ہیں، وہ بہر حال ظاہری اعمال و عقائد سے ایک بالاتر حقیقت ہے۔ اعمال و عقائد یا تو اس ہُدٰی کے ثمرات و برکات ہیں یا اس کے حصول کے اسباب و ذرائع، وہ بعینہٖ ہُدٰی نہیں ہیں۔ اعمال و عقائد میں آدمی کا اہتمام و انہماک جتنا بڑھتا جائے گا اتنا ہی اس کے لیے هُدًى میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ چنانچہ فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (۱۷۔ محمد) (جو ہدایت کی راہ اختیار کرتے ہیں، خدا ان کی ہدایت میں اضافہ کرتا ہے)

اسلام میں بنیادی نیکیاں

آخری سوال کے جواب میں گزارش ہے کہ قرآن کے تدبر سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ اسلام میں بنیادی نیکیوں کی حیثیت نماز اور زکوٰۃ کو حاصل ہے۔ دوسری نیکیاں انھی دو بڑی نیکیوں کے تحت ہیں، بلکہ انھی سے پیدا ہوتی ہیں۔ چناں چہ قرآن کے بے شمار مقامات میں ان دونوں کا ذکر اس طرح آیا ہے کہ ان کا ذکر آگیا تو گویا سب کا ذکر آگیا۔ مثلاً فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ (۱۱۔ توبہ) (پس اگر وہ توبہ کر لیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمھارے دینی بھائی بن گئے) حضرت اسماعیلؑ کی تعریف میں فرمایا ہے، وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا (۵۵۔ مریم) (اور وہ اپنے کنبے کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی منقول ہے، وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝ (اور اس نے مجھے نماز اور روزہ کی ہدایت کی جب تک جیوں) (۳۱۔ مریم)

مذکورہ بالا آیات میں اگرچہ ذکر نماز اور زکوٰۃ ہی کا ہے لیکن ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ صرف یہی دو چیزیں مراد نہیں ہیں بلکہ دوسری نیکیاں بھی مراد ہیں لیکن ان ساری نیکیوں کی جڑ چونکہ یہی دونوں چیزیں

ہیں تو جب جڑ کا ذکر آگیا تو شاخوں کا ذکر خود بخود ہو گیا۔

ان دونوں چیزوں کی حقیقت پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ فی الواقع دین میں ان کی حیثیت ہونی بھی یہی چاہیئے۔ ایک آدمی کے اللہ تعالیٰ کا ٹھیک بندہ بن جانے کے لیے آخر کس چیز کی ضرورت ہے؟ اسی چیز کی کہ ایک طرف وہ اپنے رب سے ٹھیک ٹھیک جڑ جائے اور دوسری طرف خلق سے اس کا تعلق صحیح بنیاد پر قائم ہو جائے؛ نماز انسان کو خدا سے صحیح طور پر جوڑ دیتی ہے اور انفاق سے خلق کے ساتھ اس کا تعلق بالکل صحیح بنیاد پر استوار ہو جاتا ہے۔ ایک شخص اگر اپنے رب کے حقوق ادا کرتا ہے اور خلق کے حقوق پہچانتا ہے تو وہ تمام نیکیوں کی کلید پا گیا۔ انھی دو کی مدد سے وہ دوسری ساری نیکیوں کے دروازے بھی کھول لے گا اور سب کا اختیار کر لینا اس کے لیے سہل ہو جائے گا۔ اسی سے ملتی جلتی بات حضرت مسیح نے بھی فرمائی ہے۔ انجیل متی ۲۲ = ۳۵ - ۴۰ میں ہے۔

"اور ان میں سے ایک عالم شرع نے آزمانے کے لیے اس سے پوچھا اے استاد، توریت میں کون سا حکم بڑا ہے؟ اس نے اس سے کہا کہ خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ۔ بڑا اور پہلا حکم یہی ہے۔ اور دوسرا اس کی مانند یہ ہے کہ اپنے پڑوسی سے اپنے برابر محبت رکھ۔ انھی دو حکموں پر تمام توریت اور انبیا کے صحیفوں کا مدار ہے۔"

حضرت مسیح علیہ السّلام کے اس ارشاد سے صاف واضح ہے کہ انھی دونوں نیکیوں پر تمام دین و شریعت کا مدار ہے اور ان کا بنیادی نیکیاں ہونا صرف قرآن ہی سے واضح نہیں ہوتا بلکہ تورات، انجیل اور تمام انبیاء کے صحیفوں میں ان کی یہی حیثیت ہے۔

۵- آگے کا مضمون ــــ آیات ۶-۷

یہ ان لوگوں کی خصوصیات بیان ہوئی ہیں جو قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے تھے۔ آگے ان لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے جو اس نعمت سے محروم رہنے والے ہیں۔ فرمایا۔

آیات ۶-۷

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ⑥ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ⑦

ترجمۂ آیات ۶-۷

جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے لیے یکساں ہے ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، وہ ایمان لانے والے

نہیں ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے۔ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔ ۶-۷

۶- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (۶)

کفر کی حقیقت

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا: کفر کے معنی اصل لغت میں ڈھانکنے اور چھپانے کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ شکر کے ضد کی حیثیت سے بھی استعمال ہوا ہے اور ایمان کے ضد کی حیثیت سے بھی۔ پہلی صورت میں اس کے معنی ناشکری اور کفرانِ نعمت کے ہوتے ہیں۔ دوسری صورت میں انکار کے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ لفظ کی اصل روح ان دونوں معنوں کے اندر موجود ہے۔

قرآن مجید میں یہ لفظ مطلق بھی استعمال ہوا ہے اور اپنے مفعول کے ساتھ بھی۔ جہاں مفعول کے ساتھ استعمال ہوا ہے وہاں تو متعین طور پر اس مفعول ہی کا کفر وانکار مراد ہے۔ لیکن جہاں کسی مفعول کے بغیر مطلق صورت میں استعمال ہوا ہے وہاں بالعموم قرآن تمام چیزوں کے انکار کے معنی میں استعمال ہوا ہے جن پر ایمان لانا ضروری ہے لیکن کہیں کہیں ناشکری اور کفرانِ نعمت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے جس کا پتہ قرینہ اور موقع و محل سے چلتا ہے۔

الَّذِينَ كَفَرُوا سے کون مراد ہیں؟

موقع کلام کا تقاضا یہ ہے کہ الَّذِينَ كَفَرُوا سے یہاں انکار کرنے والوں کا کوئی مخصوص گروہ مراد ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ان لوگوں کی چند خاص صفات بھی بیان ہوئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان کے لیے ڈرانا اور نہ ڈرانا دونوں برابر ہے، یہ کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں، یہ کہ اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑ چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حال تمام کفار کا نہیں تھا، ان میں بہتیرے ایسے بھی تھے جو ابتدا میں منکر و مخالف رہے لیکن بعد میں اسلام لائے۔ اس وجہ سے یہ امر تو بدیہی ہے کہ یہاں کوئی مخصوص گروہ مراد ہے۔ البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ گروہ کن لوگوں کا ہے؟

ہمارے نزدیک اس سے مراد قریش، اہل کتاب اور منافقین کے وہ لیڈر اور سردار ہیں جن پر قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت پوری طرح واضح ہو چکی تھی لیکن اس وضاحت کے باوجود وہ محض ضد، ہٹ دھرمی، انانیت اور حسد و تکبر کے سبب سے مخالفت کر رہے تھے۔ اس تخصیص کے بعض وجوہ یہ ہیں۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس سے اوپر والے ٹکڑے میں اس گروہ کا بیان ہوا ہے جو قرآن پر ایمان

لانے والا تھا۔ وہاں ہم نے هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کی تفسیر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اس سے اہلِ کتاب اور بنی اسماعیل کے وہ تمام سلیم الفطرت اور خدا ترس لوگ مراد ہیں جن کے ضمیر زندہ، جن کی صلاحیتیں محفوظ اور جن کے دل بیدار تھے۔ انھی کے مقابل میں مذکورہ آیات میں اس گروہ کا بیان ہو رہا ہے جو ایمان لانے والا نہیں ہے۔ یہ تقابل خود دلیل ہے کہ اس سے مراد قریش اور اہلِ کتاب میں سے وہ لوگ ہوں جن کو دنیا پرستی اور حسد و انانیت نے بالکل اندھا بہرا کر دیا تھا، جن کی فطرت مسخ ہو چکی تھی اور جو قبولِ حق کی تمام صلاحیتوں سے یک قلم محروم ہو چکے تھے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں قرآن نے اس گروہ کی جو خصوصیات، اس کا نام لیے بغیر بیان کی ہیں بعینہٖ وہی خصوصیات دوسرے مقامات میں یا تو نام کی صراحت کے ساتھ بیان کی ہیں یا ایسے واضح قرائن کے ساتھ بیان کی ہیں جن سے گروہ کا تعین آپ سے آپ ہو جاتا ہے۔ ان مقامات کو سامنے رکھ کر اگر اس آیت کے اجمال کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے تو آدمی اسی نتیجہ تک پہنچتا ہے جس نتیجہ تک ہم پہنچے ہیں، یعنی اس سے مشرکین، یہود اور منافقین کے وہ سردار اور لیڈر مراد لیے جائیں جن پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی تھی کہ قرآن کی دعوت حق ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے۔ یہاں ہم چند آیتیں نقل کرتے ہیں جن سے ہماری رائے کی تائید ہوتی ہے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ○ (۱۰۶-۱۰۸ نحل)	جس نے کفر کیا اللہ کا ایمان کے بعد، بجز ان کے جو مجبور کیے گئے اور جن کے دل ایمان پر جمے رہے، پر جن کے سینے کفر کے لیے کھل گئے تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اور اللہ کافر قوم کو راہ یاب نہیں کرتا۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر، کانوں پر اور جن کی آنکھوں پر اللہ نے مہر کر دی ہے اور یہی لوگ ہیں جو بے خبر ہیں۔

اس آیت میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ جو لوگ ایمان لا چکنے یا حق کے واضح ہو جانے کے بعد محض دنیا پرستی کی وجہ سے کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں ان پر اللہ کا غضب ہوتا ہے، ان کے لیے عذاب عظیم ہے، ان کے لیے خدا ایمان کی راہ نہیں کھولا کرتا، ان کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے حقیقی مصداق اگر ہو سکتے تھے تو سردارانِ قریش، علمائے یہود اور منافقین ہی ہو سکتے تھے

یا پھر وہ لوگ جو انھی کی روش اختیار کریں۔

دوسری جگہ تمام انبیا کے مخالفین و معاندین کے بارہ میں فرمایا ہے:

تِلْكَ الْقُرَىٰ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَائِهَا وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِن قَبْلُ كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِ الْكَافِرِينَ (۱۰۱ - اعراف)

یہ بستیاں ہیں جن کی سرگزشتیں ہم تم کو سناتے ہیں، ان کے پاس ان کے انبیا کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے لیکن وہ ایمان لانے والے نہ بنے، بوجہ اس کے کہ وہ جھٹلاتے رہے پہلے سے۔ اسی طرح اللہ مہر کر دیا کرتا ہے کافروں کے دلوں پر۔

خاص طور پر یہود کے بارہ میں فرمایا ہے:

فَبِمَا نَقْضِهِم مِّيثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِم بِآيَاتِ اللَّهِ وَقَتْلِهِمُ الْأَنبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا (۱۵۵ - نساء)

پس بوجہ اس کے کہ انھوں نے اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو توڑا، اللہ کی آیات کا انکار کیا، نبیوں کو ناحق قتل کیا اور کہا کہ ہمارے دل تو بند ہیں بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب سے ان پر مہر کر دی ہے تو وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر بہت کم۔

اسی طرح منافقین کے بارہ میں یہ الفاظ وارد ہیں:

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا فَطُبِعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ (۳ - منافقون)

یہ اس وجہ سے کہ وہ ایمان لائے، پھر انھوں نے کفر کیا پس ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی سو وہ نہیں سمجھتے۔

قرآن کی ان تصریحات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ زیر بحث آیت میں الَّذِينَ كَفَرُوا کا اشارہ ایک خاص گروہ کی طرف ہے، لیکن یہ گروہ نہ تو مخصوص طور پر مشرکین کا ہے نہ محدود و مفہوم میں اہل کتاب کا بلکہ یہ مشرکین اور اہل کتاب دونوں گروہوں کے ان افراد پر مشتمل ہے جو حق کو اچھی طرح پہچان چکنے کے بعد اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔

سلف سے اس آیت کی تاویل میں جو اقوال منقول ہیں ان سے بھی ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک اس سے اہل کتاب کے وہ ہٹ دھرم لوگ مراد ہیں جو ان تمام پیشین گوئیوں کو جھٹلا چکے تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں ان کے صحیفوں میں موجود تھیں اور اس طرح انھوں نے اس عہد کو توڑ دیا تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان سے آخری نبی سے متعلق لیا تھا۔ ربیع بن انس کے نزدیک اس سے ان مختلف پارٹیوں کے لیڈر مراد ہیں جو اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھیں۔ یہ دونوں قول ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں بس فرق اگر ہے تو یہ ہے کہ ربیع بن انس کی تاویل نسبتہً جامع اور

وسیع ہے۔ قرآن کے نظائر سے اسی کی تائید ہوتی ہے اس وجہ سے ہم نے اسی کو اختیار کیا ہے۔
ءَاَنذَرْتَهُمْ: انذار کے معنی ڈرانے، ہوشیار کرنے اور خبردار کرنے کے ہیں۔ انبیا علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ ایک طرف تو نہایت ٹھوس انفسی و آفاقی دلائل پر مبنی ہوتی ہے۔ دوسری طرف اس میں انذار و تبشیر کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ تبشیر کا مفہوم اس فوز و فلاح اور اس کامیابی و کامرانی کی بشارت دینا ہے جو نبی کی دعوت قبول کر لینے اور اس کی بتائی ہوئی صراط مستقیم اختیار کر لینے سے دنیا اور آخرت دونوں میں حاصل ہوتی ہے۔ انذار کا مفہوم ان خطرات و مہالک سے آگاہ کرنا ہے جن سے نبی کی تکذیب کرنے والوں کو دنیا اور آخرت دونوں میں لازماً دوچار ہونا پڑتا ہے۔ انبیا علیہم السلام عام حالات میں یہ دونوں ہی فرض انجام دیتے ہیں۔ لیکن جہاں ضدی اور ہٹ دھرم لوگ مقابل میں آن کھڑے ہوتے ہیں جن کی مخالفت کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں بلکہ محض حسد اور عناد کی بنا پر ہوتی ہے، وہاں قدرتی طور پر نبی کی دعوت میں انذار کا پہلو غالب ہو جاتا ہے کیونکہ اس وقت حالات اسی کے متقاضی ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہاں آپ کے کام کو صرف انذار ہی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ آیت زیر بحث کا تعلق، جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، ان مخالفین و معاندین سے ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں کر رہے تھے بلکہ یہ جانتے ہوئے کر رہے تھے کہ آپ نبی برحق ہیں اور قرآن اللہ کی کتاب ہے۔

انذار ہو یا تبشیر دونوں کی حقیقت ان قدرتی نتائج سے آگاہ کرنا ہے جو ایمان یا کفر کے اندر مضمر ہیں، جس طرح ایک طبیب اپنے زیرِ علاج مریض کو دوا اور پرہیز کے فوائد اور بدپرہیزی اور مرض سے غفلت کے نتائج سے آگاہ کرتا ہے اسی طرح پیغمبر بھی اپنی قوم کو اپنی دعوت کے ماننے اور نہ ماننے کے فوائد اور نتائج سے آگاہ کرتا ہے۔

انذار کی حقیقت

بعض لوگ انذار کی اس حقیقت سے بے خبر ہونے کے سبب سے مذہب کے خلاف یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ یہ موہوم خطرات کے ڈراوے سنا سنا کر لوگوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے، انسان کی عقل سے اپیل نہیں کرتا۔ یہ معترض عموماً دو باتوں سے بے خبر ہیں، ایک تو یہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ قرآن کی دعوت صرف انذار و تبشیر ہی پر مبنی نہیں ہے بلکہ وہ اپنے اندر نہایت مضبوط انفسی و عقلی دلائل بھی رکھتی ہے، انذار و تبشیر اس کی دعوت کا صرف ایک پہلو ہے۔ دوسری چیز جس سے یہ بے خبر ہیں وہ ایمانی و اخلاقی اقدار کی قدر و قیمت ہے۔ یہ لوگ اس بات سے تو واقف ہیں کہ سنکھیا کھا لینے سے آدمی مر جایا کرتا ہے لیکن یہ حقیقت ان کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ کفر، نفاق اور جھوٹ سے بھی انسان ہلاک ہو جایا کرتا ہے۔ پیغمبر کو چونکہ اخلاقی اقدار کے ثمرات و نتائج کا اچھی طرح علم ہوتا ہے اس وجہ سے وہ لوگوں کو ان سے آگاہ کرتا ہے اور اسی اندازِ بیان میں آگاہ کرتا ہے جو اندازِ بیان اس کے علم و یقین کے شایانِ شان ہوتا ہے۔ اسی چیز کو قرآن مجید انذار کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۷)

ختم کا مفہوم

خَتَمَ اللّٰهُ: خَتْمٌ کے معنی عربی زبان میں موم یا مٹی یا کسی اسی طرح کی چیز پر ٹھپہ لگانے کے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ خط پر مہر لگانے اور کسی چیز کے منہ کو اس طرح بند کر دینے کے لیے استعمال ہونے لگا جس کے بعد نہ اس میں کوئی چیز داخل ہو سکے اور نہ کوئی چیز اس سے نکل سکے۔

قرآن مجید میں بعض جگہ جب اللہ تعالیٰ کسی فعل کو اپنی طرف منسوب فرماتا ہے تو اس سے مقصود نفس اس فعل کو اپنی طرف منسوب کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس قانون یا اس سنّت کو اپنی طرف منسوب کرنا ہوتا ہے جس قانون اور سنت کے تحت وہ فعل ظہور میں آتا ہے۔ چونکہ یہ قانون خود اللہ تعالیٰ ہی کا مقرر کردہ ہوتا ہے اس وجہ سے وہ فعل جو اس قانون کے تحت ظہور میں آتا ہے بعض اوقات قانون کے بنانے والے کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔ تعبیر مطلب کا یہ اسلوب کم و بیش ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔ عربی زبان اور قرآن مجید میں بھی اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ اسی اسلوب کے مطابق یہاں دلوں پر مہر لگانے کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے لیکن مقصود اس سے اس سنت اللہ کی اپنی طرف نسبت ہے جو اس نے ہدایت و ضلالت کے لیے جاری کر رکھی ہے اور جس کے تحت دلوں پر مہر کرنے کا یہ فعل واقع ہوتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ یہ سنت اللہ کیا ہے تو اس کی وضاحت ہم آگے کریں گے۔

سمع کے واحد لانے کی وجہ

عَلٰى سَمْعِهِمْ: ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ یہاں سمع کا لفظ واحد کیوں استعمال ہوا جب کہ قلوب و ابصار کے الفاظ جمع استعمال ہوئے ہیں۔ کلام کی ہم آہنگی کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ بھی جمع یعنی اسماع استعمال ہوتا۔ میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ اس چیز کا تعلق اہل زبان کے طریق استعمال سے ہے۔ قرآن میں یہ لفظ کم و بیش ۲۰-۲۲ مقامات میں استعمال ہوا ہے اور اکثر جگہ قلوب، افئدہ اور ابصار کے ساتھ استعمال ہوا ہے لیکن ہر جگہ واحد ہی کی شکل میں استعمال ہوا ہے، کہیں بھی جمع کی شکل میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید زبان کے لحاظ سے بھی ایک معیاری چیز ہے اس وجہ سے ماننا پڑے گا کہ فصحائے عرب اس سیاق میں اس لفظ کو اسی طرح استعمال کرتے رہے ہیں۔

۷۔ ختمِ قلوب کی حقیقت اور اس کے بارے میں قانونِ الٰہی

یہاں جس ختم قلوب کا ذکر ہے اس کے بارے میں دو باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیں۔

ایک یہ کہ اس ختم سے مراد ختم ظاہری نہیں ہے بلکہ ختم معنوی مراد ہے۔ جہاں تک ظاہری چیزوں کے دیکھنے، سننے اور سمجھنے کا تعلق ہے یہ لوگ ان کو دیکھتے، سنتے اور سمجھتے تھے لیکن اس مشرب کے لوگ اپنی سمجھ بوجھ کی تمام قوتیں اور صلاحیتیں دنیا کے ظواہر و محسوسات ہی تک محدود رکھتے ہیں، ان ظواہر و محسوسات کے پس پردہ جو حقائق ہیں ان کی طرف نہ تو یہ خود متوجہ ہوتے ہیں اور نہ کسی دوسرے توجہ دلانے والے کی بات پر

کان ہی رہ جاتے ہیں۔ دنیا اور زخارفِ دنیا میں ان کا انہماک اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ کسی اور چیز کی طرف توجہ کرنے کی ان کے اندر گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ یہ اپنی ذہانت و فطانت اسی ایک مقصد پر صرف کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آسمان و زمین کا طول و عرض ناپنے میں تو ان کی عقل بڑی تیز ہو جاتی ہے لیکن روحانی اقدار و حقائق کے معاملہ میں وہ بالکل ہی کند ہوتی ہے۔ یہ صورتِ حال ان کے مذاق کو بھی اس قدر بگاڑ دیتی ہے کہ صرف وہی باتیں ان کو اچھی لگتی ہیں جن سے ان کے اس بگڑے ہوئے مذاق کو غذا ملے۔ جن باتوں سے اس کی حوصلہ شکنی ہو، خواہ وہ کتنی ہی معقول ہوں، ان سے ان کی طبیعت کو وحشت ہوتی ہے۔ اسی صورتِ حال کو یہاں ختمِ قلوب کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

دوسری یہ کہ اس ختمِ قلوب سے یہ مراد نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو ان کی ماؤں کے پیٹوں ہی سے ان کے دلوں پر ٹھپے لگا کر پیدا کیا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اپنی بداعمالیوں سے اپنے آپ کو اس قدر بگاڑ لیا ہے کہ ان کے دل پیغمبر کی بات سننے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئے۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کا تعلق ہے اس نے ہر انسان کو اچھی صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے، اس کو نیکی و بدی کا امتیاز بخشا ہے اور ساتھ ہی نیکی کو پسند کرنے اور بدی سے نفرت کرنے کا مذاق بھی اس کے اندر ودیعت کیا ہے۔ ان فطری صلاحیتوں سے آراستہ کرنے کے بعد اس نے انسان کو آزاد چھوڑا ہے کہ چاہے وہ نیکی کا راستہ اختیار کرے چاہے بدی کا۔ آگے چل کر یہی اختیاری نیکی یا بدی ہے جو اس کی فطری صلاحیتوں کے بنانے یا بگاڑنے میں اصلی دخل رکھتی ہے۔ اگر انسان نیکی اور بھلائی کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس سے اس کی فطری صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو نیکی کی راہ میں ترقی کی توفیق ملتی ہے اور اگر وہ خواہشاتِ نفس کے پیچھے لگ کے بدی کے راستے پر چل پڑتا ہے تو پھر آہستہ آہستہ اس کا دل برائی کا رنگ پکڑنا شروع کرتا ہے یہاں تک کہ یہ رنگ اس پر اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ پھر اس کے اندر نیکی کی کوئی رمق باقی ہی نہیں رہ جاتی۔ یہی مقام ہے جہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کے قانون کے تحت آدمی کے دل پر مہر لگ جاتی ہے اور اس کا مذاقِ طبیعت اس قدر بگڑ جاتا ہے کہ اس کی ساری دلچسپی صرف بدی ہی کے کاموں سے باقی رہ جاتی ہے، نیکی کے کام کرنا تو الگ رہا نیکی کی باتیں سننے سے بھی اس کو وحشت ہوتی ہے۔

چناں چہ قرآن مجید میں یہ بات بار بار بیان ہوئی ہے کہ آدمی کے دل پر یہ مہر اس کے گناہوں کی پاداش میں لگتی ہے۔ چند آیات ملاحظہ ہوں:

اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (۱۰۰- اعراف)	کیا ان لوگوں کو جو اگلوں کے بعد اس زمین کے وارث ہوئے اس بات سے کوئی سبق حاصل نہیں ہوتا کہ اگر ہم چاہتے تو ان کے گناہوں کی پاداش میں ان پر بھی آفت لاتے اور ان کے دلوں پر مہر کر

دیتے پس وہ سننے سمجھنے سے رہ جاتے۔

اس آیت میں اس بات کی صاف تصریح ہے کہ دلوں پر مہر گناہوں کی سزا کے طور پر لگتی ہے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ	اور ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں
فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا	لے کر آئے لیکن یہ لوگ ایمان لانے والے نہ تھے
مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ	کیوں کہ یہ پہلے سے جھٹلاتے رہے تھے، اسی طرح
عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَمَا	اللہ کافروں کے دلوں پر مہر کر دیا کرتا ہے، ہم نے
وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَ	ان میں سے اکثر کے اندر عہد کی پابندی نہیں پائی
اِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ۝	(بلکہ) ہم نے ان میں سے اکثر کو بدعہد اور نافرمان
(۱۰۱-۱۰۲- اعراف)	پایا۔"

یعنی اللہ تعالیٰ کے عہد اور اس کے احکام کی خلاف ورزی میں یہ پہلے سے مشاق تھے۔ اس وجہ سے جب ان کے رسول بھی ان کے پاس اللہ کی آیات اور اس کی نشانیاں لے کر آئے تو انھوں نے ان کی بھی کوئی پروا نہ کی۔ جو لوگ حق کی تکذیب میں اس طرح دیدہ دلیر اور ڈھیٹ ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر کر دیا کرتا ہے جس سے ان کی عقل بالکل ہی ماری جاتی ہے۔

اس سے زیادہ وضاحت و تصریح کے ساتھ یہود کے بارے میں فرمایا ہے:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ	پس بوجہ اس کے کہ انھوں نے عہد کو توڑا، اللہ
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ	کی آیات کا انکار کیا، انبیاء کو ناحق قتل کیا اور
حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ	کہا کہ ہمارے دل تو بند ہیں بلکہ اللہ نے ان کے
طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا	دلوں پر ان کے کفر کے سبب سے مہر کر دی ہے تو
يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ (۱۵۵- نساء)	وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر بہت کم۔

مذکورہ بالا آیات سے ایک تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی ماں کے پیٹ سے اس کے دل پر مہر کر کے نہیں بھیجتا بلکہ یہ مہر جس کے دل پر بھی لگتی ہے اس کے گناہوں کے قدرتی نتیجہ کے طور پر لگتی ہے۔

دوسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ ہر درجہ کا گناہ وہ چیز نہیں ہے جس کے نتیجہ میں کسی کے دل پر مہر لگ جایا کرے، بلکہ کوئی فرد یا کوئی گروہ جب حق کو حق سمجھتے ہوئے، اپنے دل کی گواہی کے بالکل خلاف محض ضد، نفسانیت اور ہٹ دھرمی کے سبب سے اس کی مخالفت کرتا ہے اور اس مخالفت پر جم جاتا ہے تب اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے اور وہ صحیح طور پر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت

سے محروم ہو جایا کرتا ہے۔

تیسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ دل کا اس طرح مہر بند ہو جانا اور سمع و بصر کی صلاحیتوں سے اس طرح محروم ہو جانا اللہ تعالیٰ کا ایک عذاب ہے جو اس کی نعمتوں کی ناشکری کی پاداش میں کسی فرد یا گروہ پر اس دنیا میں نازل ہوتا ہے اور اسی عذاب کا فطری نتیجہ وہ عذابِ عظیم ہے جس میں اس طرح کے لوگ اس زندگی کے بعد والی زندگی میں مبتلا ہوں گے۔ چنانچہ زیرِ بحث آیت کے آخر میں یہ جو فرمایا ہے کہ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے) وہ درحقیقت اسی ختمِ قلوب کے اس قدرتی نتیجہ کا بیان ہے جو آخرت میں ظاہر ہوگا۔

ختمِ قلوب کی جو حقیقت ہم نے بیان کی ہے اس کی یہی حقیقت احادیث سے بھی واضح ہوتی ہے۔ ہم طوالت سے بچنے کے لیے صرف ایک حدیث پر یہاں اکتفا کرتے ہیں۔

ان المومن اذا اذنب كانت نكتة سوداء في قلبه فان تاب ونزع واستعتب صقل قلبه وان زادت حتى تعلو قلبه فذلك الران الذي قال الله تعالى كلا بل ران على قلوبهم ما كانوا يكسبون۔

(ابن کثیر بحوالہ ترمذی)

مومن جب کوئی گناہ کر بیٹھتا ہے تو اس کے سبب سے اس کے دل پر ایک سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیتا ہے، اس گناہ سے باز آ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیتا ہے تو اس کے دل کا وہ دھبہ صاف ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کے گناہوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ ان کی سیاہی اس کے پورے دل پر چھا جاتی ہے تو یہی وہ رَین ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ کلا بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون (ہرگز نہیں، بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی سیاہی چھا گئی ہے)

سلف صالحین کے نزدیک بھی ختمِ قلوب کی یہی حقیقت ہے۔ ابن کثیر نے اعمش کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ اعمش کہتے ہیں کہ مجاہد نے ایک مرتبہ ہمیں سمجھایا کہ سلف (صحابہؓ) دل کو اس ہتھیلی کے مانند سمجھتے تھے۔ جب آدمی کسی گناہ میں آلودہ ہوتا ہے تو (انھوں نے اپنی انگلی سکیڑتے ہوئے سمجھایا) دل اس طرح سکڑ جاتا ہے۔ پھر جب مزید گناہ کرتا ہے تو (دوسری انگلی کو سکیڑتے ہوئے بتایا) دل اس طرح بھنچ جاتا ہے اسی طرح تیسری انگلی کو سکیڑا۔ یہاں تک کہ یکے بعد دیگرے تمام انگلیوں کو سکیڑ لیا۔ پھر فرمایا کہ جب دل گناہوں کے غلبہ سے اس طرح بھنچ جاتا ہے تو اس پر مہر کر دی جاتی ہے۔ مجاہد نے بتایا کہ سلف (صحابہؓ) اسی چیز کو وہ رین قرار دیتے تھے جس کا ذکر كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ الآیہ میں آیا ہے۔

جبر اور اختیار

ختمِ قلوب کی اصل حقیقت واضح ہو جانے کے بعد ہمیں جبر و اختیار کی اس بحث میں پڑنے کی ضرورت

باقی نہیں رہی جو اشاعرہ اور معتزلہ کے درمیان برپا ہے اور جس میں یہ حضرات بے ضرورت اس آیت کو بھی گھسیٹ لے گئے ہیں۔ قرآن مجید نہ تو اس جبر ہی کے حق میں ہے جس کے مدعی اشاعرہ ہیں اور نہ اس اختیار ہی کے حق میں ہے جس کے علم بردار معتزلہ ہیں بلکہ حق ان دونوں کے درمیان ہے لیکن یہ مقام اس مسئلہ کی تفصیلات کے لیے موزوں نہیں ہے۔ ہم صرف چند اصولی باتیں یہاں بیان کیے دیتے ہیں جو ان لوگوں کے لیے ان شاء اللہ کفایت کریں گی جو اس مسئلہ پر ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہو کر صرف علمی ذہن کے ساتھ غور کریں گے۔ یہ اصولی باتیں مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ مبداء فطرت سے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اچھی فطرت پر پیدا کیا ہے، اس کو نیکی و بدی کا امتیاز بخشا ہے اور ان میں سے جس کو بھی وہ اختیار کرنا چاہے اس کو اختیار کرنے کی اس کو آزادی دی ہے۔ اس کے بعد اس کا نیک یا بد بننا اس کے اپنے رویہ اور توفیقِ الٰہی پر منحصر ہے سو اگر وہ نیکی کی راہ اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو نیکی کی توفیق بخشتا ہے اور اگر وہ بدی کی راہ پر جانا چاہتا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ، اگر چاہتا ہے، بدی کی راہ پر جانے کے لیے بھی چھوڑ دیتا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ جن چیزوں پر انسان کا مواخذہ کرے گا یا جن پر اس کو اجر دے گا ان کے لیے اس نے انسان کو اختیار و ارادہ کی آزادی بھی بخشی ہے۔ جو لوگ اس اختیار و ارادہ کے حامل نہیں ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو مواخذہ سے بھی بری رکھا ہے۔ یہ اختیار و ارادہ انسان کا ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کا عطا کردہ ہے اور اس کا استعمال بھی انسان اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی کے تحت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت اور حکمت کے تحت انسان کے جس ارادہ کو چاہے پورا نہ ہونے دے البتہ اگر وہ اپنی کسی حکمت کے تحت اس کے کسی نیکی کے ارادہ کو پورا نہیں ہونے دیتا تو اس نیکی کے اجر سے اس کو محروم نہیں کرتا۔ اسی طرح اگر اس کی کسی بدی کی اسکیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے نہیں دیتا تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اس کے اخروی خمیازہ سے بھی لازماً اس کو بری قرار دے دے۔

۳۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ کی مطلق مشیت کا بیان ہوا ہے اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اس کی مشیت کو اس کے سوا کوئی دوسرا روک یا بدل نہیں سکتا۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کی مشیت سرے سے کسی عدل و حکمت کی پابند ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ عادل اور حکیم ہے، اس کا کوئی کام بھی عدل اور حکمت سے خالی نہیں ہوتا اس وجہ سے جہاں کہیں بھی اس نے اپنی مشیت کو بیان فرمایا ہے اس کو اس قانونِ عدل و حکمت ہی کے تحت سمجھنا چاہیے جس کے تحت اس نے اس دنیا کے نظم کو چلانا پسند فرمایا ہے۔ یہ خیال کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ اپنی جو سنت اس نے خود جاری کی ہے اور جس قانونِ عدل کو اس نے خود پسند فرمایا ہے اپنی مشیت کے زور سے خود ہی اس کو توڑے گا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے یہ جو فرمایا ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے تو اس کے معنی یہ

نہیں ہیں کہ اس پر ہدایت وضلالت کے لیے اس نے عدل وحکمت کا کوئی ضابطہ سرے سے مقرر ہی نہیں کیا ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ہدایت وضلالت اس سنت کے مطابق واقع ہوتی ہے جو اس نے ہدایت وضلالت کے لیے مقرر کر رکھی ہے اور کوئی دوسرا اس سنت کے توڑنے یا بدلنے پر قادر نہیں ہے۔

۴۔ قرآن مجید میں بعض افعال اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمائے ہیں لیکن ان سے اصل مقصود، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، ان افعال کی نسبت نہیں ہے بلکہ ان ضابطوں اور ان قوانین کی نسبت ہے جن کے تحت وہ افعال واقع ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ ضابطے اور قاعدے خود اللہ تعالیٰ ہی کے ٹھہرائے ہوئے ہیں اس وجہ سے کہیں کہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے تحت واقع ہونے والے افعال کو بھی اپنی طرف منسوب کر دیا ہے، مثلاً فرمایا ہے فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم (جب وہ کج ہو گئے تو اللہ نے ان کے دل کج کر دیے) یا فرمایا ہے ونقلب افئدتھم وابصارھم (اور ہم ان کے دل اور ان کی آنکھیں الٹ دیتے ہیں) اس طرح کے مواقع پر عموماً قرآن مجید میں وہ اصول بھی بیان کر دیا جاتا ہے جس کے تحت وہ فعل واقع ہوتا ہے، مثلاً اس طرح کی کوئی بات کہہ دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نہیں گمراہ کرتا مگر فاسقوں کو۔ ان اشارات کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ قاری اصل حقیقت کی طرف متوجہ ہو جائے اور ظاہر الفاظ سے کسی مغالطہ میں نہ پڑ جائے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ کا ازلی وابدی اور محیط کل علم، اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی سنتوں میں سے کسی سنت کی نفی نہیں کرتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ ہر شخص کے متعلق ازل سے یہ جانتا ہے کہ وہ ہدایت کی راہ اختیار کرے گا یا ضلالت کی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ ہدایت یا ضلالت کو اسی سنت اللہ کے مطابق اختیار کرے گا جو ہدایت وضلالت کے لیے اس نے مقرر کر رکھی ہے۔

ان اصولی باتوں کو جو شخص پیش نظر رکھے گا وہ انشاء اللہ ان بہت سی الجھنوں سے آپ سے آپ نکل جائے گا جو جبر واختیار کے معاملہ میں قرآن مجید کی پیدا کردہ نہیں بلکہ متکلمین کی موشگافیوں کی پیدا کردہ ہیں۔

۸۔ مجموعہ آیات ۶۔۷ کا اصل مدعا

ان آیات کا اصل مدعا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف یہ خبر دینا نہیں ہے کہ فلاں گروہ کے لوگ، خواہ تم ان کو ڈراؤ یا نہ ڈراؤ، ایمان لانے والے نہیں ہیں بلکہ یہ دونوں آیتیں (۶۔۷) چند نہایت اہم حقائق سے پردہ اٹھا رہی ہیں۔ ہم ان میں سے بعض باتوں کی طرف یہاں اشارہ کریں گے تاکہ ان آیات کی اصل تعلیم واضح ہو سکے۔

۱۔ پہلی چیز جو ان آیات کے اندر سب سے زیادہ واضح ہے وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسکین وتسلی اور آپ کے مخالفین کے لیے سرزنش اور دھمکی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا ہے کہ آپ یہ خیال نہ کریں کہ یہ لوگ اپنے کفر پر جو جمے ہوئے ہیں تو اس وجہ سے جمے ہوئے ہیں کہ آپ کے انذار وتبلیغ میں

کوئی کسر ہے یا آپ جو کلام سنا رہے ہیں وہ کسی پہلو سے غیر موثر ہے۔ نہ آپ کے انذار و تبلیغ میں کوئی کسر ہے نہ اس کلام میں کوئی نقص یا خلا ہے بلکہ ساری خرابی خود ان لوگوں کے اپنے دلوں کے اندر ہے۔ اللہ کے دین کی صداقتوں کو جھٹلاتے جھٹلاتے اب یہ قانونِ الٰہی کی زد میں آچکے ہیں جس کے سبب سے ان کے دلوں کے اندر سے اثر پذیری کی، ان کے کانوں کے اندر سے حق نیوشی کی اور ان کی آنکھوں کے اندر سے عبرت نگاہی کی ساری صلاحیتیں سلب ہو چکی ہیں۔ اب آپ ان کی صلاح و فلاح کی طرف سے بالکل مایوس ہو جائیں۔ اب ان کے لیے اگر کوئی چیز باقی رہ گئی ہے تو وہ اللہ کا عذاب ہے جس سے وہ لازماً دوچار ہوں گے۔

۲۔ دوسری حقیقت جو واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر ایمان و ہدایت کے داخل ہونے کا رستہ اس کا دل، اس کی عقل، اس کے کان اور اس کی آنکھیں ہیں۔ اگر آدمی ان کو کھلا رکھے، آفاق اور انفس کے اندر ہر وقت جو مشاہدے ہو رہے ہیں ان پر بصیرت کی نگاہ ڈالے۔ خدا کے کلام اور داعیانِ حق کی باتوں کو سراپا گوش ہو کر سنے اور پھر ان ساری چیزوں پر تدبّر و تفکر کرے اور راستبازی و دیانتداری کے ساتھ جن حقائق تک پہنچے ان کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے اور ان کو حرزِ جاں بنائے تب اس کو ہدایت ملتی ہے۔ اگر وہ یہ راہ نہ اختیار کرے اور قدرت کی بخشی ہوئی ان صلاحیتوں سے نہ کام لے تو وہ لاکھ سر مارے لیکن اس کے لیے ایمان و ہدایت کی راہ نہیں کھل سکتی۔

۳۔ تیسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ انسان کی روحانی و عقلی ترقی اور اس کے کمال کا تمام تر انحصار اس بات پر ہے کہ اللہ تعالےٰ نے انسان کو سمع، بصر اور فواد کی جو عظیم صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں ان کو ان کے صحیح مقصد کے لیے استعمال کرے۔ اگر آدمی ان کو استعمال نہ کرے یا استعمال تو کرے لیکن اس اعلیٰ مقصد کے لیے استعمال نہ کرے جس کے لیے یہ فی الحقیقت عطا ہوئی ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو وبال بنا دیتا ہے۔ ان کے وبال ہونے کی صورت ان کے استعمال نہ کرنے کی حالت میں تو یہ ہوتی ہے کہ آدمی سب کچھ رکھنے کے باوجود فکر و عمل کے ہر میدان میں عاجز و درماندہ رہتا ہے اور غلط استعمال کرنے کی صورت میں یہ وبال اس طرح بنتی ہیں کہ یہ آدمی کو زندگی بھر ہر وادی اور ہر صحرا میں ہرزہ گردی کراتی ہیں یہاں تک کہ اس خلائے لامتناہی میں بھی اس کو چکر کراتی ہیں اگر نہیں پہنچنے دیتیں تو اسی دروازے پر جو نجات اور فلاح کا اصلی دروازہ ہے۔

۹۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۸ - ۱۶

اب آگے انھی ایمان نہ لانے والوں کے ایک اور گروہ کا بیان ہو رہا ہے جس کی خصوصیات اور جس کا ذہنی پس منظر مذکورہ بالا گروہ سے کچھ مختلف ہے اس وجہ سے وہ مستقلاً ذکر کیے جانے کا مستحق ہے۔ فرمایا:۔

آیات ۸-۱۶

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۸ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۹ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝۱۰ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝۱۱ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۲ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۴ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۱۵ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝۱۶

ترجمہ آیات ۸-۱۶

اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو دعوی کرتے ہیں کہ ہم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔ یہ لوگ اللہ کو اور ایمان لانے والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں حالاں کہ یہ خود اپنے آپ ہی کو دھوکا دے رہے ہیں اور اس کا احساس نہیں کر رہے ہیں۔ ان کے دلوں میں روگ تھا تو اللہ نے ان کے روگ کو بڑھا دیا، اور ان کے لیے دردناک

عذاب ہے بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولتے رہے ہیں۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ پیدا کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے لوگ ہیں۔ آگاہ رہو کہ یہی لوگ فساد برپا کرنے والے ہیں لیکن یہ محسوس نہیں کر رہے ہیں۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس طرح ایمان لاؤ جس طرح لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں، کیا ہم اس طرح ایمان لائیں جس طرح بے وقوف لوگ ایمان لائے ہیں؟ آگاہ رہو، کہ بے وقوف یہی لوگ ہیں لیکن یہ جانتے نہیں۔ اور جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب اپنے شیطانوں کی مجلسوں میں پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو آپ لوگوں کے ساتھ ہیں، ہم تو ان لوگوں سے محض مذاق کرتے ہیں۔ اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے اور ان کو ان کی سرکشی میں ڈھیل دیئے جا رہا ہے، یہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دی تو ان کی تجارت ان کے لیے نفع بخش نہ ہوئی اور یہ ہدایت پانے والے نہ بنے۔ ۸ - ۱۶

۱۶- الفاظ کی تحقیق

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (۸) يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (۹)

'الناس' سے مراد

مِنَ النَّاسِ: الناس کا لفظ اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اس عام سے ایک خاص گروہ مراد ہے اور وہ گروہ ہے یہود کا۔ اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ صرف یہود ہی ہو سکتے تھے جن کے اندر کی کوئی جماعت وہ روپ دھار سکتی تھی جس کی طرف قرآن نے ان آیات میں اشارہ کیا ہے۔ آگے مستقل عنوان سے اس اجمال کی وضاحت آئے گی۔

'خدع' اور 'مخادعت' کا مفہوم

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ: مخادعت کے معنی ہیں دھوکا دینے کی کوشش کرنا عام اس سے کہ وہ دھوکا کامیاب ہو سکے یا نہ ہو سکے۔ یہاں مخادعت کا لفظ بھی استعمال فرمایا ہے اور خدع کا لفظ بھی استعمال فرمایا ہے۔ جہاں لفظ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے وہاں تو مخادعت استعمال ہوا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کی خواہش تو کوئی شخص اپنی حماقت کے سبب سے کر سکتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کو دھوکا دے نہیں سکتا۔

برعکس اس کے خود ان کے لیے خدع کا لفظ استعمال ہوا ہے کیوں کہ جو شخص خدا کو دھوکا دینے کا ارادہ کرتا ہے وہ اپنی اس کوشش میں تو ناکام رہتا ہے لیکن خود اپنے آپ کو وہ ضرور دھوکے میں ڈال دیتا ہے۔

وَمَا يَشْعُرُوْنَ : شعور کا لفظ کسی محسوس چیز کے ادراک کے لیے آیا کرتا ہے۔ یہاں اس لفظ کا استعمال اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اگرچہ خدا کو دھوکہ دینے کی کوشش میں خود دھوکا کھا جانا ایک محسوس ہونے والی چیز ہے لیکن یہ بر خود غلط لوگ جو ہوشیاری و چالاکی کے زعم کے باوجود اتنے غبی ہیں کہ اس حقیقت کا احساس نہیں کر رہے ہیں کیونکہ ابھی اس کا نتیجہ ان کے سامنے نہیں آیا ہے۔

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ (۱۰)

مرض کا مفہوم

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ : مرض کا لفظ قرآن میں عموماً دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک کینہ اور حسد کے معنی میں۔ دوسرے نفاق کے معنی میں۔ جن مقامات میں یہ لفظ نفاق کے ساتھ استعمال ہوا ہے وہاں تو یہ واضح طور پر کینہ اور حسد کے معنی میں ہے لیکن جن مقامات میں یہ تنہا استعمال ہوا ہے وہاں یا تو دونوں معانی اس کے اندر جمع ہیں یا قرینہ اس کے دونوں معانی میں سے کسی ایک معنی کو متعین کرتا ہے۔ یہاں واضح قرینہ اس بات کے لیے موجود ہے کہ اس سے مراد حسد ہے کیونکہ یہاں جس گروہ کا بیان ہے آگے چل کر واضح ہو گا کہ یہ یہود ہی کے اندر کا ایک گروہ ہے اور یہود کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ پر ایمان لانے والوں سے جو حسد تھا وہ معلوم و مشہور ہے۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر اس کا ذکر فرمایا ہے۔

زیادتی مرض کا پہلو

فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا : یہاں حسد کے بڑھانے کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے جو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے تو یہ درحقیقت اس سنت کو اس نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے جس کے تحت یہ فعل انجام پاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے سینہ کو ایمان و اسلام کی جلوہ گاہ بنانے کے بجائے اس کو بغض و حسد ہی کی پرورش گاہ بنائے رکھنا چاہتا ہے تو اس کے سامنے اسی طرح کے حالات و واقعات ظاہر ہوتے ہیں جو اس کی اسی بس بھری فصل کی آبیاری کرتے ہیں۔ یہود کو مسلمانوں پر حسد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام کی نعمت کیوں دے دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام اور اس کی برکتوں کی روز افزوں ترقی نے ان کے اس حسد کے اسباب میں اور زیادہ اضافہ کیا اور یہ اضافہ برابر ہوتا ہی رہا یہاں تک کہ اس چیز نے ان کو بالکل تباہ کر کے چھوڑا۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ (۱۱) اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ (۱۲)

فساد فی الارض کی حقیقت

لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ : افساد فی الارض قرآن مجید کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم اس نظام حق کو بگاڑنا یا اس کو بگاڑنے کی کوشش کرنا ہے جو اللہ واحد کی عبادت اور اس کے احکام و قوانین کی اطاعت پر مبنی ہوتا ہے اور جس کی دعوت انبیائے کرام علیہم السلام لے کر آتے ہیں۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ جس

طرح اس کائنات کا نظام تکوینی اس وجہ سے قائم ہے کہ اس کے اندر ایک ہی رب قدیر و قہار کا ارادہ کارفرما ہے، اگر اس کے اندر کسی اور کا زور و اختیار بھی چلتا ہوتا تو یہ آن کے آن میں درہم برہم ہو کے رہ جاتا اسی طرح اس کے نظام تشریعی کے اندر اگر کسی اور کی عبادت و اطاعت کے جواز یا دخل کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے اس کا مزاج بالکل ہی بگڑ کے رہ جاتا ہے اور یہ بگاڑ سارے نظام تمدن کو خراب کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس وجہ سے ہر وہ کوشش قرآن کے نزدیک فساد فی الارض کے حکم میں داخل ہے جو اس بگاڑ کا دروازہ کھولے اگرچہ یہ کوشش بظاہر اصلاح کے نیک ارادہ ہی کے ساتھ کیوں نہ کی جائے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ (۱۳)

كَمَا آمَنَ النَّاسُ: یہاں الناس سے مراد وہ مسلمان ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ (۱۴)

وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ: خلوا کے بعد الیٰ کا صلہ تقاضا کرتا ہے کہ یہاں کوئی فعل ایسا محذوف مانا جائے جو اس صلہ سے مناسبت رکھنے والا ہو۔ ہم نے ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔

لفظ 'شیطان' کی تحقیق

شیطان کا لفظ شاط یشیط سے فعلان کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی جلد باز، تند خو مشتعل مزاج اور شریر و سرکش کے آتے ہیں۔ ان خصوصیات کے حامل جنوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور انسانوں میں سے بھی۔ یہاں یہ لفظ یہود کے ان لیڈروں کے لیے استعمال ہوا ہے، جو فساد فی الارض کے اس سارے کھیل کی رہنمائی کر رہے تھے۔

اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ (۱۵)

اللہ کا مذاق

اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ: مد کے معنی ڈھیل دینے اور کسی کی رسی دراز کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی سرکشی میں آگے بڑھتے جا رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان پر حجت تمام کرنے کے لیے ان کی رسی دراز کرتا جا رہا ہے تاکہ جب ان کو پکڑے تو ان کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ اپنے جس مذاق کا ذکر فرمایا ہے یمدھم فی طغیانھم کے الفاظ اسی کی وضاحت کر رہے ہیں۔ یہ لوگ خوش تھے کہ مسلمانوں کو بے وقوف بنانے اور اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ حالانکہ صحیح راہ بتانے والے کو اپنے خیال کے مطابق جو شخص دھوکا دے کر ایک غلط راہ اختیار کرتا ہے وہ راہ بتانے والے کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا بلکہ وہ خود اپنے آپ ہی کو

آوارہ گردی کی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے۔ اب یہ محض اس کی خود فریبی اور حماقت ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس نے راہ بتانے والے کو دھوکا دیا ہے۔ دھوکا تو درحقیقت اس نے خود کھایا ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ (۱۶)

اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ: اشتراء کے معنی خریدنے کے ہیں۔ آدمی جس چیز کو کوئی قیمت ادا کر کے خریدتا ہے اس کو اس شے کے مقابل میں، جس کو وہ قیمت قرار دیتا ہے، ترجیح دیتا ہے۔ یہیں سے اس لفظ کے اندر ترجیح دینے کا مفہوم پیدا ہو گیا اور اس معنی میں یہ لفظ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔

'اشتراء' کا مفہوم

۱۱۔ یہ اشارہ کن لوگوں کی طرف ہے؟

اوپر دو گروہوں کا ذکر ہوا ہے۔ ایک ان لوگوں کا جو ایمان لائے، دوسرے ان لوگوں کا جو ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ان دونوں گروہوں کے بعد یہ ایک تیسرے گروہ کا بیان ہے جو تعلق تو رکھتا ہے ایمان نہ لانے والے گروہ سے لیکن اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے ان سے کچھ مختلف مزاج رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ گروہ کن لوگوں کا ہے؟ لوگوں نے عام طور پر یہ سمجھا ہے کہ یہ منافقین کا گروہ ہے لیکن یہاں شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ منافقین کے لفظ سے جو گروہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے وہ ظاہراً ہر پہلو سے اپنے آپ کو مسلمانوں کے اندر شامل رکھنے کی کوشش کرتا تھا، اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اس کو جو عداوت تھی وہ چھپی ہوئی تھی جو صرف خاص خاص مواقع ہی پر ظاہر ہوتی تھی لیکن اس گروہ کی جو خصوصیات قرآن نے بیان فرمائی ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہ تو باطناً مسلمانوں کے ساتھ تھے اور نہ زبانی ہی ان کے ساتھ اتفاق کے اظہار کے لیے آمادہ تھے۔ مثلاً یہ لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان کا دعویٰ تو کرتے تھے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان کا اظہار زبان سے بھی کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ علاوہ ازیں یہ اپنے آپ کو مسلمانوں سے بالاتر سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب ان سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ اگر ایمان کے مدعی ہو تو مسلمانوں کی طرح ایمان لاؤ تو کھلم کھلا مسلمانوں کو بے وقوف ٹھہراتے تھے۔ اس وجہ سے ان کو عام معنی میں منافقین کے زمرہ سے سمجھنا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ منافقین کے زمرہ سے تعلق نہیں رکھتے تو پھر یہ کون لوگ ہیں اور کس زمرہ سے تعلق رکھتے ہیں؟

یہود کا ایک خاص گروہ

ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی یہود ہی کے اندر کا ایک گروہ تھا لیکن اسلام کی مخالفت میں اس کا کردار اس گروہ کے کردار سے کچھ مختلف نوعیت کا تھا جس کا ذکر اوپر گزرا ہے۔ اوپر جس گروہ کا ذکر ہوا ہے وہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات بھی سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا،

بلکہ اندھا بہرا ہو کر آپ کی مخالفت پر اُتر آیا تھا لیکن یہ گروہ اسلام کی مخالفت مصلحت اندیشی کے رکھ رکھاؤ اور مصالحت پسندی کے رُوپ میں کرنا چاہتا تھا۔

مندرجہ بالا آیات پر اچھی طرح غور کرنے سے اس گروہ کا جو ذہنی پس منظر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ جہاں تک اسلام دشمنی کے جذبہ کا تعلق ہے یہ گروہ پچھلے گروہ سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا۔ یہود میں دوسروں کے بالمقابل اپنی برتری کا جو احساس تھا وہ بھی ان لوگوں کے اندر بدرجہ اتم موجود تھا، بنی اسماعیل پر، ان کے اندر آخری نبی کی بعثت کی پیشین گوئی کے سبب سے، یہود کو جو حسد تھا، اس حسد میں بھی یہ مبتلا تھے بلکہ اس پیشین گوئی کے عملاً ظہور، اسلام کی روز افزوں ترقی اور عربوں کے اندر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر معمولی مقبولیت نے ان کے اس حسد میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا تھا۔ ان ساری باتوں میں یہ لوگ اپنے ہم قوموں کے شریک تھے۔ لیکن یہ اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لیے مجرد انکار اور ضد کی اس پالیسی کو صحیح نہیں سمجھتے تھے جو یہود کے اس گروہ نے اختیار کی تھی جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ بلکہ یہ لوگ یہودیت اور اسلام کے درمیان ایک قسم کے سمجھوتے کے خواہش مند تھے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ اسلام بھی اپنی جگہ پر رہے اور ایک مذہبی گروہ کی حیثیت سے خود ان کو جو مرتبہ اور امتیاز حاصل ہے وہ بھی باقی رہے۔ اس کی جو شکل ان کے ذہن میں تھی وہ ان آیات کی روشنی میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ مسلمانوں سے اس بات کے خواہش مند تھے کہ مسلمان اپنی طرح ان کو بھی مومن اور خدا پرست سمجھیں کیونکہ جہاں تک اللہ اور آخرت پر ایمان کا تعلق ہے ان کا دعویٰ تھا کہ ان دونوں چیزوں پر یہ بھی ایمان رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ مسلمان اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پیغمبر اور ان کی پیش کی ہوئی کتاب کو آسمانی کتاب کی حیثیت سے ماننا چاہتے ہیں تو مانیں لیکن ان سے اُن کے ماننے کے لیے اصرار نہ کریں، اگر انھوں نے دوسروں کی نجات بھی ان کے ماننے پر منحصر کر دی اور جس نے نہ مانا اس کو اللہ اور اس کے رسول کا مکذب قرار دے دیا تو اس سے ان کے نزدیک اس ملک کے مختلف مذہبوں اور ان کے پیروؤں کے درمیان ایک سخت قسم کی منافرت اور کشمکش کی حالت پیدا ہو جائے گی اور مذہبی رواداری کی وہ فضا جو اس ملک کے اندر اب تک قائم رہی ہے ختم ہو کے رہ جائے گی۔ اپنے اسی خیال کی بنا پر یہ لوگ اپنے آپ کو اصلاح کرنے والا بھی سمجھتے تھے۔ یعنی ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ ہم اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کو نہیں مان رہے ہیں تو یہ کسی افساد کی کوشش نہیں ہے بلکہ یہ عین اصلاح کی کوشش ہے کیوں کہ اس طرح ہم اس انتشار کو روک رہے ہیں جو اس نئی نبوت اور اس نئی دعوت سے پیدا ہو رہا ہے۔

۱۲۔ مجموعہ آیات ۸-۱۶ پر تدبر

اس گروہ کو اچھی طرح مشخص کر لینے اور اس کے ذہنی پس منظر کو وضاحت کے ساتھ سمجھ لینے کے بعد

ان آیات پر دوبارہ تدبر کی نگاہ ڈالیے تو ایک ایک لفظ کی خوبیاں اور ایک ایک فقرہ کی بلاغتیں اور باریکیاں اچھی طرح سمجھ میں آئیں گی۔ نیز یہ واضح ہوگا کہ اسلام کے یہ چالاک دشمن کیا کہتے اور کیا چاہتے تھے اور قرآن نے ان کی ہر بات پر کتنی سخت اور کیسی برمحل گرفت کی ہے۔

سب سے پہلے ان کے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے دعوے کو لیجیے۔ اس دعوے سے ان کا مقصود محض اپنے آپ کو قرآن کی گرفت سے بچانا تھا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے اوپر قرآن میں جو اتنی لے دے ہو رہی ہے یہ بالکل غلط اور ناجائز ہے۔ ہم بھی اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں؛ دینداری اور خدا پرستی تنہا مسلمانوں ہی کا اجارہ نہیں ہے۔ اس دھونس سے وہ اپنے خلاف مسلمانوں کی زبانیں بند کرنا چاہتے تھے، حالاں کہ یہ حقیقت ان سے مخفی نہیں تھی کہ قرآن ان سے جس ایمان واسلام کا مطالبہ کر رہا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جس کے یہ مدعی ہیں۔ قرآن کا مطالبہ ان سے جس ایمان واسلام کے لیے تھا وہ صرف اس شکل میں پورا ہو سکتا تھا جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خود قرآن پر اس طرح ایمان لاتے جس طرح مسلمان ایمان لائے تھے چوں کہ یہ لوگ اس بات سے اچھی طرح واقف ہوتے ہوئے بات بنانے اور دھونس جمانے کی کوشش کر رہے تھے اس وجہ سے قرآن نے ان کی اس کوشش کو مخادعت یعنی دھوکہ بازی سے تعبیر فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی واضح فرما دیا کہ ان کی یہ دھوکا بازی صرف مسلمانوں ہی کے ساتھ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی ہے کیوں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے منشا کو سمجھتے ہوئے اس سے گریز کی راہ تلاش کرتا ہے وہ درحقیقت خدا کے ساتھ چال بازی کرتا ہے خواہ وہ اپنے اس فعل کے اس مکروہ پہلو کو سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو۔

پھر یہ حقیقت بھی واضح فرما دی کہ وہ کوشش تو کر رہے ہیں اللہ کو اور مسلمانوں کو دھوکا دینے کی لیکن درحقیقت وہ اپنے آپ ہی کو دھوکا دے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص چال بازی کر کے اپنے کسی ناصح مشفق کے مشورہ کو ٹھکراتا ہے وہ اس ناصح مشفق کا کچھ نہیں بگاڑتا بلکہ وہ اپنے آپ ہی کو کسی کھڈ میں گراتا ہے۔ فرض کیجیے ایک حاذق اور خیر خواہ طبیب کسی مریض کے لیے ایک نسخہ لکھتا ہے۔ مریض اس نسخہ کو تو استعمال نہیں کرتا، البتہ طبیب کو مختلف حیلوں حوالوں سے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اس سے بہتر نسخہ استعمال کر رہا ہے اور وہ تمام تندرستوں سے زیادہ تندرست ہے۔ ہو سکتا ہے کہ طبیب اس کی جھوٹی قسموں اور اس کی ہیر پھیر کی باتوں سے خاموش ہو جائے لیکن اس دھوکا بازی کا خمیازہ کس کے سامنے آئے گا، طبیب کے سامنے یا مریض کے سامنے؟ ظاہر ہے کہ مریض ہی کے سامنے۔ اب یہ محض اس کی اپنی بے عقلی ہوگی اگر وہ اس امر واقعی کا احساس نہ کرے۔

اس کے بعد قرآن نے یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ ایک حقیقت کا جرأت کے ساتھ استقبال کرنے کے بجائے انھوں نے جھوٹ اور فریب کی یہ روش جو اختیار کی ہے اس کا سبب ان کا وہ حسد ہے جو بنی اسماعیل

کے خلاف وہ رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسمٰعیل کے اندر اپنا آخری نبیؑ مبعوث فرمایا، اس پر اپنی کتاب اتاری، اس نبی کی دعوت پھیلنے لگی اور اس بات کے آثار صاف نظر آنے لگے کہ اب دنیا کی دینی رہنمائی کی باگ بنی اسرائیل کے ہاتھوں سے نکل کر بنی اسمٰعیل کے ہاتھوں میں جا رہی ہے تو یہ غصہ اور حسد سے کھولنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ انعام ان پر کیوں فرمایا، اس کے حق دار تو ہم تھے اور جتنا ہی بنی اسمٰعیل پر اللہ تعالیٰ کے انعامات بڑھتے گئے اتنا ہی ان کے حسد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

ان لوگوں کے اندر حق پسندی اور اخلاقی جرأت ہوتی تو یہ خود اس حق کا ساتھ دے کر اللہ تعالیٰ کے اس انعام میں حصہ دار بن سکتے تھے لیکن یہ لوگ نہ تو دینی پیشوائی کے موروثی پندار سے دستبردار ہونے کے لیے تیار تھے، نہ اپنے حسد کے سبب سے اس بات کے لیے تیار ہوئے کہ بنی اسمٰعیل کے اندر پیدا ہونے والے نبیؑ پر ایمان لائیں اور نہ یہی جرأت رکھتے تھے کہ خم ٹھونک کر میدان میں آئیں اور اسلام کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکیں۔ جب ان باتوں میں سے کسی بات کی بھی ہمت وہ نہ کر سکے تو واحد راہ جو ان کے لیے باقی رہ گئی تھی وہ یہی تھی کہ جھوٹ اور فریب کے دامن میں پناہ لیں۔ چناں چہ انھوں نے ایسا ہی کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو خبر دار کیا کہ یہ انھوں نے بہت ہی غلط پناہ گاہ تلاش کی ہے اگر اس پناہ گاہ کے اندر انھوں نے چھپنے کی کوشش کی تو دنیا میں حسد کی آگ میں جلتے رہیں گے اور آخرت میں ان کا انجام دردناک عذاب ہے۔

دوسری چیز جو خاص طور پر توجہ کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی جو مخالفت کر رہے تھے قرآن نے اس کو زمین میں فساد برپا کرنے سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ درحقیقت کسی فعل کو اس کے آخری نتائج سے تعبیر کرنے کا ایک معروف اسلوب ہے جو قرآن میں بہت سے مقامات میں استعمال ہوا ہے۔ اس اسلوب کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مخاطب کے سامنے اس کے کسی فعل کا آخری نتیجہ آجاتا ہے۔ یہ چیز کسی فعل سے باز رکھنے میں بھی مددگار ہوتی ہے اگر فعل بُرا ہو، اور اس پر ابھارنے میں بھی مددگار ہوتی ہے، اگر فعل اچھا ہو۔ بات جو ان لوگوں سے کہنی تھی وہ تو یہی تھی کہ دینِ حق کی دعوت میں روک نہ بنیں لیکن محض اتنی بات کہنے سے ان کے سامنے یہ حقیقت پوری طرح واضح نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی اس روش سے اس دنیا کی تباہی و بربادی میں کس درجہ کا حصہ لے رہے ہیں۔ اس وجہ سے اس روش کا وہ انجام ان کے سامنے رکھ دیا گیا ہے جو سامنے آسکتا ہے اگر خدانخواستہ وہ اپنی اس مہم میں کامیاب ہو جائیں۔

رہا اس زمین کا صلاح و فساد تو اس کا انحصار، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، صرف اس چیز پر ہے کہ اس کے اندر کس کا حکم اور کس کا قانون چلتا ہے۔ اس کے حقیقی خالق و مالک کا، یا کسی اور کا۔ اگر اس کے خالق و مالک کا حکم چلتا ہے تو اس سے اس زمین پر امن و عدل کا صحیح نظام قائم ہو گا اور اس کی وہ تمام برکتیں ظہور میں آئیں گی جو اس کے اندر ودیعت ہیں۔ اور اگر صورت اس کے برعکس ہو تو اس کے ہر گوشہ میں فساد رونما ہو گا اگرچہ اس فساد کو تہذیب و تمدن کے کتنے ہی خوش نما ناموں سے موسوم کر دیا جائے۔

انبیاء علیہم السلام چونکہ اس زمین میں خدا کا قانون جاری کرنا چاہتے ہیں اس وجہ سے ان کی جدوجہد اس زمین کی اصلاح کی حقیقی جدوجہد ہوتی ہے اور اس کی مخالفت کی راہ میں ہر قدم فساد کا قدم ہے خواہ وہ بظاہر کتنے ہی نیک ارادہ کے ساتھ اٹھایا جائے۔ اسلام کے یہ مخالفین اپنی اس مخالفت کے لیے وجہ جواز یہ پیش کرتے تھے کہ ایک نئی نبوت کے ظہور اور خاص کر اس کے اس دعوے کے سبب سے کہ خدا کا حقیقی دین وہی ہے جس کو اس نے پیش کیا ہے، اس ملک میں سخت انتشار پیدا ہو رہا ہے اس وجہ سے یہ جو اس کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں یا اس سے لوگوں کو روک رہے ہیں تو اس ملک میں فساد نہیں مچا رہے ہیں بلکہ اس کی اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں۔ فساد تو ان کے خیال میں وہ لوگ برپا کر رہے تھے جنھوں نے یہ نئی دعوت بلند کی تھی یا اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ قرآن مجید نے اس کا جواب یہ دیا کہ فساد برپا کرنے والے تو درحقیقت یہی لوگ ہیں لیکن ان کو اپنے فساد کا احساس نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنی خود غرضی اور تنگ نظری کے سبب سے اس حقیقت کو سمجھ نہیں رہے ہیں کہ اس دنیا کی اصلاح اس طرح نہیں ہو سکتی کہ حق اور باطل، کفر اور اسلام دونوں کو ملا کر رکھا جائے، بلکہ اس کی اصلاح کا واحد راستہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرمائی ہے اس کی پیروی کی جائے۔ ان لوگوں کا پہلا جرم تو یہ ہے کہ ان لوگوں نے خدا کی بتائی ہوئی صراط مستقیم گم کی اور اب جب کہ اللہ تعالیٰ اس کو از سر نو دنیا کے لیے کھول رہا ہے تو ان مفسدین کی کوشش یہ ہے کہ لوگ اس صراط مستقیم کو اختیار کرنے کے بجائے اپنی اپنی پسند کردہ پگڈنڈیوں ہی پر بھٹکتے رہیں اور اس حماقت کو یہ لوگ اصلاح سمجھتے ہیں حالاں کہ یہ عین افساد ہے۔

تیسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے اس دعوائے ایمان اور اس مظاہرۂ رواداری کے پس پردہ مسلمانوں کے خلاف نفرت اور تحقیر کا جو خبث چھپا ہوا تھا قرآن نے نہایت خوبی کے ساتھ اس سے بھی پردہ اٹھا دیا ہے تاکہ ان کی دھوکا بازی کے سبب سے اگر کسی مسلمان کو یہ غلط فہمی ہو رہی ہو کہ یہ لوگ دوسروں کے مقابل میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے کچھ فراخ دل ہیں تو یہ غلط فہمی دور ہو جائے۔ یہ پردہ قرآن نے اس طرح اٹھایا ہے کہ ان کا یہ راز فاش کر دیا ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں پر تو اپنے مومن ہونے کی دھونس جماتے ہیں تاکہ مسلمان ان کو اپنے سے کچھ مختلف نہ سمجھیں لیکن دوسری طرف ان کے خبث باطن کا یہ حال ہے کہ اگر ان سے کوئی یہ کہہ بیٹھے کہ اگر آپ لوگ ایمان کے مدعی ہیں تو سیدھے سیدھے مسلمانوں کی طرح قرآن پر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کیوں نہیں لاتے تو یہ بات سنتے ہی ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے اور اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ کیا ہم ان ناسمجھ اور احمق لوگوں کی طرح ہر ایرے غیرے کو نبی مان لیں اور اس کے پیچھے لگ جائیں؟

قرآن مجید نے ان کی اس بات کا جواب یہ دیا کہ بے وقوف اور احمق تو درحقیقت یہی لوگ ہیں